خطبات

حصہ سوم

از

حضرت علامہ سید محمد رضی مجتہد

ناشر

ادارہ نشر علوم دینیہ

PRICE; PAK. Rs.
PRICE: FOR. $ 6/-

خطبات

حصہ سوم

از

علامہ سید محمد رضی مجتہد

ناشر

ادارۂ نشرِ علوم دینیہ سی ۹۶ بلاک نمبر ۱۰
فیڈرل بی ایریا - کراچی

جملہ حقوق بحق ادارۂ نشرِ علوم دینیہ محفوظ ہیں!

نام کتاب .... خطبات (حصّہ سوم)
طبع اوّل .... سنہ ۱۹۸۶ء
تعداد .... پانچ سو
مطبع .... انجولی شادی کارڈ وخطاطی مرکز (A-78/20)

مُصنّف

علامہ سیّد محمد رضی مجتہد

ناشر

ادارۂ نشرِ علوم دینیہ کراچی

ملنے کا پتہ

ادارۂ نشرِ علوم دینیہ
سی ۹۶ - بلاک نمبر ۱
فیڈرل بی ایریا کراچی
ٹیلیفون نمبر:- 683025

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوانات		نمبر شمار
۵	کلمۂ طیبہ	(فیچر)	۱
۲۸	سورۃ الناس	(")	۲
۴۰	سورۃ والعصر	(")	۳
۵۰	سورۃ البقرۃ کا آخری رکوع	(")	۴
۵۹	الکرسی	(")	۵
۶۶	قرآنی تعلیمات حقیقت پسندی کی ضامن ہیں		۶
۷۶	سرورِ کائنات بحیثیت منتظم		۷
۸۲	رسول کریم بحیثیت مقنن۔		۸
۸۷	صادق وامین		۹
۹۴	جمعتہ الوداع		۱۰
۱۱۵	ملکی تحفظ		۱۱
۱۲۶	شہادت کے فضائل		۱۲
۱۳۶	اعلائے کلمتہ الحق		۱۳
۱۴۱	قومی اتحاد کی بنیادیں		۱۴
۱۵۰	عزم واستقلال		۱۵
۱۵۴	خود اعتمادی		۱۶
۱۶۴	مظاہر قدرت سے عبرت!		۱۷
۱۷۳	اسلام کا تصور انسان		۱۸
۱۸۱	برکت ورحمت کی مبارک رات		۱۹
۱۸۵	عقیدۂ توحید کا اثر انسانی معاشرہ پر!		۲۰

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
۱۹۴	انسان اور تصور آخرت	۲۱
۲۰۱	اشتراک عمل	۲۲
۲۱۰	روزہ اور روحانیت	۲۲
۲۱۴	روزہ کے اجتماعی فوائد	۲۳
۲۱۸	بخل ایک اخلاقی برائی	۲۴
۲۲۵	امت وسط کا قرآنی مفہوم	۲۵
۲۳۳	خود غرضی	۲۶
۲۴۰	بزدلی	۲۷
۲۴۷	وقت کی پابندی	۲۸
۲۵۴	قول وعمل میں یکسانیت	۲۹
۲۶۱	اجتماعی ذمہ داریاں	۳۰
۲۶۹	اسمگلنگ اسلام کی نظر میں!	۳۱
۲۷۵	حقوق اللہ وحقوق العباد	۳۲
۲۷۹	شہداء احد	۳۳
۲۸۴	بیت اللہ کے لئے نذر اور ہدیے	۳۴
۲۸۹	تلبیہ کی روح (اظہار بندگی)	۳۵
۲۹۴	فرض شناسی	۳۶
۳۰۱	غیر مسلموں کے ساتھ کس طرح سلوک کیا جائے	۳۷
۳۰۶	امن وسلامتی	۳۸
۳۱۵	وفائے عہد	۳۹
۳۱۹	روزہ اور باہمی ہمدردی	۴۰
۳۲۴	عزم وعمل	۴۱
۳۳۱	مقام بدر	۴۲
۳۳۷	عزم وہمت	۴۳
۳۴۵	تلاش حق	۴۴
۳۵۲	اپنے اوپر اعتماد	۴۵
۳۵۸	خدمت خلق	۴۶
۳۶۵	یکجہتی	۴۷

کلمۂ طیّبہ

عام اشارات:-

"کلمۂ طیبہ" کے لفظی معنی۔ پاک و پاکیزہ کلمہ۔

اس کے اصطلاحی معنیٰ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

اِلٰہ :- حقیقی معبود۔ "اللہ" ایسی ذات جس میں کوئی عیب اور نقص نہ ہو اور ہر کمال پایا جاتا ہو۔ الٰہ اسم صفت ہے۔ اللہ اسم ذات الٰہی ہے۔

"اولوالعزم" وہ رسول جن کی شریعت پچھلی شریعت کی نسخ کرنے والی اور وہ پانچ ہیں۔ نبی کسی شریعت کی تبلیغ پر مقرر نہیں ہوتا مگر رسول شریعت کی تبلیغ پر خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔

"کلمۂ طیبہ" میں مکمل ترین عقیدۂ توحید اور انتہائی جامع عقیدۂ رسالت و امامت موجود ہے۔ جس میں اسلام کی ہر تعلیم سمٹ آئی ہے۔

طلبہ پورے سکون اور غور کے ساتھ سب باتیں سنیں اور اساتذہ متعدد طلبہ سے سوالات کریں۔ خاص خاص باتیں طلبہ کاپیوں پر نوٹ کرتے جائیں۔ کاپیاں تیار رہیں۔

نسیم احمد   دادا ابا! آداب

دادا ابا۔ جیو بیٹا عمر دراز ہو!۔ پھلو پھولو! خوب پڑھو لکھو۔ نیک شہرت حاصل کرو۔ اپنے خاندان، قوم اور ملک کے لئے فخر بنو۔ اسلام کی خدمت کرو۔ اللہ اور رسول ؐ تم سے خوش رہیں اور اپنے آباؤ و اجداد کا نام روشن کرو!۔ ابھی میں ظہر کی نماز سے فارغ ہوا ہوں! ہاں میاں کہاں سے آ رہے ہو؟۔ آج کئی روز کے بعد تم میرے پاس آئے ہو۔ پہلے تو تقریباً روزانہ ہی آجایا کرتے تھے۔ کچھ نصیب دشمناں طبیعت تو خراب نہ تھی!۔ تمہارے پاپا اور امی کیسی ہیں اور بھائی بہنیں سب ٹھیک ٹھاک ہیں؟

نسیم احمد۔ جی دادا ابا! ویسے تو سب ٹھیک ہیں۔ پاپا تو اپنی ملازمت پر صبح تڑکے سے چلے جاتے ہیں اور بھائی صاحب اور بھائی جان بھی اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر چلے جاتے ہیں۔ آپا کا بھی امتحان نزدیک آگیا ہے اور ہم دونوں اپنے اپنے امتحانوں کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے میں آپ کے پاس کئی دن سے نہیں آیا۔

دادا ابا۔ ہاں بیٹا! خوب محنت کرو۔ خوب توجہ کے ساتھ تیاری کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤ گے۔ تم محنت کرو۔ ہم تم سب بچوں کے لیے دعا کریں گے۔ بس یہ ہے بیٹے! کہ تم لوگوں کو دیکھ لیتے ہیں تو طبیعت خوش ہو جاتی ہے مگر مقدم میاں! تعلیم ہی ہے۔ اس سے کبھی غفلت نہ کرنا۔ بہت سے لڑکے سال بھر تو کھیل کود میں گزار دیتے ہیں اور جب امتحان سر پر آجاتا ہے تو دن رات محنت کرتے ہیں۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کے حواس۔ نہ دن کو دن سمجھتے ہیں اور نہ رات کو رات۔ یاد واد خاک نہیں ہوتا بس کتاب پڑھتے چلے جاتے ہیں اور نتیجہ بیٹے! پھر یہ ہوتا ہے کہ صحت بھی خراب ہو جاتی ہے اور امتحان میں بھی فیل ہو جاتے

ہیں اس لئے ہر طالب علم کو یہ چاہیئے کہ سال بھر مسلسل پڑھتا رہے یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ ایک ٹائم ٹیبل بنائے اور اُس کے مطابق تعلیم کا۔ نماز کا۔ اور پھر دُوسرے ضروری کاموں کا وقت مقرر کر کے ان سب کاموں کو اپنے اپنے وقت پر روزانہ ہی انجام دیتا رہے اور پھر خالی وقت میں کھیلے بھی تفریح بھی کرے۔ کیونکہ بیٹے! دماغ کو تعلیم وغیرہ سے کسی وقت فرصت بھی دینا ضروری ہے اس طرح پڑھنے کے وقت روزانہ پڑھنا چاہیئے۔ نماز کے وقت اسے ادا کرنا چاہیئے اور کھیل اور تفریح کے وقت کھیلنا اور تفریح بھی کرنا چاہیئے۔

نسیم احمد۔ دادا ابا! آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں۔ میں تو پہلے ہی سے آپ کی اس نصیحت پر عمل کرتا ہوں اور اسی لئے تو آپ کی دُعا سے ہر امتحان میں اوّل نہیں تو دوم سے کم تو آجتک آیا ہی نہیں اور اس سال بھی میں نے دادا ابا! پورے سال محنت کی ہے اور شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہو گا کہ میں کتاب دیکھنے سے مجبور رہا ورنہ میں برابر پڑھتا اور یاد کرتا ہی رہا اور دادا ابا! اسی لئے تو آپ کی دُعا سے میرے ماسٹر صاحب مجھ پڑے خوش رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارے والدین اور تمہارے بزرگوں نے تمہاری بڑی اچھی تربیت کی ہے۔ تم بڑے اچھے اور بڑے محنتی لڑکے ہو۔

دادا ابا۔ ہاں بیٹا! اچھے بچوں کی سب ہی تعریف کرتے ہیں اور بُرے بچوں کی کون تعریف کرے گا! اور حق بات تو یہی ہے کہ گھر کے بزرگ جیسی تربیت دیں گے تو بچے بھی ویسے ہی نکلیں گے۔ گھر کے ماحول کو اور گھر والوں اور والدین اور بزرگوں کی تربیت کو بچہ کی تعلیم و ترقی میں بڑا دخل ہوتا ہے! بس بیٹا

میری خوشی اور زندگی کا حاصل تو یہی ہے کہ تم سب نیک نکلو اور پڑھ لکھ کر اپنے خاندان اور ہم لوگوں کا نام روشن کرو۔

نسیم احمد۔ دادا ابا! آج ہمارے ماسٹر صاحب نے کلاس کے ختم ہونے پر ہم سب سے کہا ہے کہ کل تم سب سے "کلمۂ طیبہ" پر مختصر مختصر تقریریں کراؤں گا۔ تم سب خوب تیاری کر کے آنا اور اپنے والدین اور بزرگوں سے بھی پوچھنا اور جو جو باتیں وہ تم کو بتائیں انھیں کلاس میں بیان کرنا پھر جو باتیں رہ جائیں گی وہ میں تم کو بتا دوں گا اور دادا ابا! انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جس لڑکے کی تقریر سب سے اچھی ہوگی اس کو انعام بھی دوں گا تو میں نے سوچا کہ مجھے کئی روز ہو گئے دادا ابا کے پاس گئے ہوئے وہ یوں ہی مجھے دیکھنے کے لئے بے چین ہوں گے۔ تو مجھے یوں بھی ان کی خدمت میں حاضری دینا ہی ہے ضمناً ان سے "کلمۂ طیبہ" کی کچھ کچھ تفصیل بھی پوچھ لوں گا اور پھر ایسی تقریر کروں گا کہ انعام حاصل کر لوں نہ پھر تو دادا ابا بھی مجھ سے بہت خوش ہو جائیں گے اور پھر میں ان سے بھی انعام لوں گا۔

دادا ابا۔ ہاں ہاں تو یہ کہو کہ تم آج یوں میرے پاس آئے ہو! اچھا خیر! نسیم بیٹے تو نے خوب کیا جو مجھ سے پوچھنے آ گئے۔ تمھیں دیکھ کر میرا دل بھی خوش ہو گیا اور اب میں تم کو "کلمۂ طیبہ" کے متعلق بڑی اچھی باتیں بتائے دیتا ہوں کہ اگر تم نے انھیں یاد رکھا اور ٹھیک طریقہ سے بیان کر دیا تو تمہارے استاد صاحب بہت خوش ہو جائیں گے اور تم ہی کو انعام ملے گا یا اگر اور لڑکوں کو بھی انعام ملا تو تمھیں سب سے زیادہ ملے گا۔

نسیم احمد۔ دادا ابا! پھر آپ بھی تو مجھے انعام دیجئے گا نا! میں آپ سے تو ضرور

انعام لے لوں گا۔

دادا ابا۔ ہاں ہاں بیٹے! کیوں نہیں۔ میں بھی تمہیں انعام دوں گا اور تمہاری دادی اماں بھی اور امی اور پاپا سب ہی خوش ہوں گے، لو دیکھو! وہ تمہاری آواز سن کر تمہاری دادی اماں بھی کمرے سے نکل آئیں، وہ تمہاری آواز سن کر تمہاری دادی اماں بھی کمرے سے نکل آئیں۔

نسیم احمد۔ دادی اماں! السلام علیکم!۔ کیسا مزاج ہے آپ کا۔ آج تو میں آپ کے پاس دن بھر کے لئے آیا ہوں اور دادا ابا سے اسکول کے سبق کی باتیں بھی پوچھ رہا ہوں اور کل تو دادی اماں! مجھے انعام لینا ہے انعام! اپنے ماسٹر صاحب سے۔

دادی اماں۔ بہت اچھا کیا نسیم بیٹے تم آ گئے۔ میں تو تمہیں سب سے زیادہ چاہتی ہوں ویسے تو میں اپنے سب پوتوں، پوتیوں کو چاہتی ہوں مگر تجھے نسّو (پیار کا نام) بیٹے! مجھے بے حد محبت ہے۔ تجھے دیکھ کر تو میرے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ اللہ! زندہ رکھے۔ عمر دراز ہو، خاندان کا نام روشن ہو،

نسیم احمد۔ دادی اماں!۔ ہاں بیٹے! آج تو میں دادا ابا سے "کلمۂ طیّبہ" پر بہت سی باتیں معلوم کر رہا ہوں کیونکہ کل مجھے اسکول میں یعنی اپنے کلاس میں اسی موضوع پر بڑی ہی! بڑی ہی! زوردار تقریر کرنا ہے دادی اماں! اور پھر تو میں انعام لا کے آپ کو دکھاؤں گا اور دادی اماں! مجھے آپ بھی انعام دیجیے گا نا! میں آپ سے بھی انعام لوں گا اور دادا ابا سے الگ لوں گا۔

دادی اماں۔ ہاں نسّو بیٹے ہم دونوں بھی تمہیں انعام دیں گے۔ تم تو ہماری

ہماری آنکھوں کے تارے ہو ہم کیوں نہ انعام دیں گے۔

دادا ابا۔ ہاں بیٹے نسیم! تو اب تم غور سے سنو اور خوب یاد رکھو۔

نسیم احمد۔ دادا ابا! میں کاپی اور پنسل بھی ساتھ لایا ہوں۔ یہ دیکھئے یہ رہی۔ آپ جو جو باتیں بتاتے جائیں گے انہیں میں نوٹ کرتا جاؤں گا۔

دادا ابا۔ دیکھو بیٹے! پہلے تو یہ سمجھ لو کہ کلمۂ طیبہ، کے معنی کیا ہیں۔ میرا مطلب تم سمجھ گئے؛ یعنی یہ جملہ جب ہم بولتے ہیں تو اس کے لفظی معنی کیا ہوتے ہیں —— دیکھو! اس قسم کے دو لفظ ہم بولا کرتے ہیں۔ ایک تو ہے "کلمہ" اور دوسرے "کلام"۔ ان دونوں لفظوں کے معنی الگ الگ ہیں۔ اب تم اس کو خوب سمجھ لو۔ "کلمہ" عربی لفظ ہے۔ اس میں کاف پر تو زبر ہے اور لام پر زیر ہے۔ اچھا اب اس کی جمع کیا آتی ہے وہ بھی سنو۔ اس کی جمع کَلِمٌ اور کَلِمات آتی ہے۔ سمجھ گئے بیٹے! جی ہاں دادا ابا! میں نے کاپی پر لکھ بھی لیا ہے۔

اچھا اب سنو کہ "کلمہ" کو اردو بول چال میں اور فارسی زبان میں بھی کبھی کبھار "لام" پر سکون کے ساتھ بول دیتے ہیں۔ یعنی "کَلْمَہ" کہہ دیتے ہیں مگر تم بیٹے اسے "کَلِمَہ" ہی کہنا "کَلْمَہ" نہ کہنا۔

پھر دیکھو میاں! اس کے لفظی معنی ہیں: ایسا مفرد یعنی اکیلا لفظ جو کچھ معنی بھی رکھتا ہو یعنی بے معنی اور مہمل نہ ہو تو ایسے لفظ کو "کَلِمَہ" کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے ہم کبھی کلمۂ حق۔ انصاف کی بات۔ کَلِمۂ خیر۔ نیکی کی بات۔ کلمۂ تکبیر۔ یعنی اللہ اکبر بھی کہتے ہیں مگر یہ یاد رکھو کہ ایسے موقع پر "کلمہ" سے ہم ایک لفظ مراد نہیں لیتے بلکہ ایک لفظ سے زیادہ بھی مراد لیتے ہیں جیسے "اللہ اکبر" میں دو لفظ ہیں۔ اچھا کبھی تم

نے سنا ہوگا کہ ہم "کلمۃ اللہ" بول کر حضرت عیسی علیہ السلام کو مراد لیتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کے کلمۂ "کن" سے جس سے مراد حکم الہی ہے، پیدا ہوئے تھے۔ غرض "کلمہ" کے بہت سے معنی ہیں۔ ان سب معنوں کو خوب ذہن میں رکھنا۔ بہت اچھا دادا آبا! نسیم بیٹے اب سنو ایک معنی کلمہ کے اصطلاحی ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے دادا آبا!۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم اسلامی اعتقادات کی باتوں میں "کلمہ" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب ہوتا ہے "لا اِلٰہ الا اللہ محمّدٌ رسولُ اللہ

نسیم احمد۔ دادا آبا! اس کے معنی کیا ہوئے۔ میں لکھتا جا رہا ہوں۔

دادا آبا۔ ہاں سنو بیٹے! اس کے معنی یہ ہوئے کہ "نہیں ہے کوئی معبود یعنی خدا سوائے اللہ کے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں" اس کی تفصیل یہ ہوئی لا۔ نہیں۔ الٰہ۔ معبود یعنی خدا۔ الاّ۔ مگر یا سوائے۔ اللہ کے معنی تو تم جانتے ہی ہو۔ مگر میں اللہ کے لفظ کی بھی ابھی تشریح کر دوں گا تا کہ تم اس سے بھی بے خبر نہ رہو۔ اچھا اس کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو حضور اقدس کا نام نامی ہے پھر "رسول اللہ" یعنی اللہ کے پیغمبر یوں سمجھو کہ اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے والے جنہیں اللہ نے اس کام کے لئے دنیا میں بھیجا ہو۔ یہ تو تھے اس کے لفظی معنی۔ اب جب کبھی کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ میں نے کلمہ طیبہ" پڑھا تو اس کی مراد یہی ہوتی ہے کہ اس نے کہا لا الٰہ الاّ اللہ محمّدٌ رسول اللہ "طیبہ" کے معنی تو وہ ہیں "پاک و پاکیزہ" اس لئے "کلمۂ طیبہ" کے معنی ہوئے پاک و پاکیزہ کلمہ"۔

نسیم احمد۔ دادا آبا! ہاں میاں!۔ آپ نے ابھی فرمایا کہ "کلمہ" کے علاوہ

علاوہ ایک اور لفظ بھی ہے یعنی "کلام" مگر آپ نے اس کے معنی نہیں بتائے۔
دادا ابا۔ بیٹے تم نے اچھا کیا مجھے یاد دلایا۔ میں بھول گیا تھا۔ دیکھو! "کلمہ" کے اصلی معنی تو میں بتا چکا ہوں یعنی ایک لفظ جو بامعنی ہو یعنی مہمل نہ ہو اس نے "کلمہ" کہتے ہیں اور "کلام" کہتے ہیں چند لفظوں یعنی کلمات کے مجموعہ کو جو بامعنی ہو یعنی مہمل نہ ہو۔ تو اب ایک لفظ تو ہوا "کلمہ" اور دو یا دو سے زیادہ کلمات کا مجموعہ ہوا "کلام" مگر میاں! اس کو نہ بھولنا کہ کبھی مجازی طور پر کئی لفظوں کے مجموعہ کو بھی "کلمہ" کہہ دیتے ہیں جیسے یہی "کلمۂ طیبہ" لیکن اصل حقیقت میں "کلمہ" ایک ہی بامعنی لفظ کو کہتے ہیں۔ سمجھ گئے نسیم! جی ہاں دادا ابا! میں بالکل سمجھ گیا کہ اصل میں تو "کلمہ" ایک ہی بامعنی لفظ کو کہتے ہیں مگر مجازی طور پر کبھی "کلام" کے لئے بھی "کلمہ" کا لفظ بول دیا جاتا ہے، اچھا بیٹے نسیم! تو میں تم کو "کلمۂ طیبہ" کے متعلق کچھ سمجھا رہا تھا۔ ابھی تک میں نے تمہیں کلمہ اور "کلام" کے معنی بتائے اور کلمہ طیبہ کے بھی معنی سمجھا دیئے۔ اب میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ "اللہ" کے معنی کیا ہیں۔ دیکھو بیٹے "اللہ" کے حقیقی اور اصلی معنی ہیں ایسی ذات جو واقعی اس کا حق رکھتی ہو کہ اس کی عبادت اور پرستش کی جائے اور اس کے لئے سجدہ کیا جائے بس اسی لئے تو "کلمۂ طیبہ" میں اس کا اعلان اور اقرار کیا جاتا ہے کہ اللہ کی ذات کے سوا کوئی بھی دوسرا حقیقی اور اصلی معبود نہیں ہے یعنی وہ قطعاً اس کا حق نہیں رکھتا کہ اس کے لئے سجدے کئے جائیں اور اس کی عبادت کی جائے۔ اس کا حق تو صرف اللہ کو ہے اور وہی سارے جہاں کا اکیلا معبود اور پروردگار ہے۔ نسیم بیٹے یہاں ایک بات یہ بھی یاد رکھنا کہ کبھی قرآن پاک میں بتوں کو بھی لفظ "الٰہ" کے ساتھ ذکر فرمایا

گیا ہے تو وہاں یہ مراد ہے کہ اُن بتوں کے پوجنے والے انھیں اپنا حقیقی معبود سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے جب کبھی بتوں کے لئے یہ لفظ قرآن میں بولا گیا ہے تو اس کی نسبت کافروں اور مشرکوں ہی کی طرف دی گئی ہے اور یوں فرمایا گیا ہے کہ ان کافروں کے معبود یعنی جنہیں وہ اپنا معبود جانتے اور سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بت ہرگز ان کے معبود نہیں ہیں بلکہ ان کا اصلی معبود صرف اللہ ہے۔ جس کا نہ کوئی مثل ہے اور نہ کوئی اس کا شریک ہے۔

اور یہی بات "کلمۂ طیبہ" میں ظاہر کی گئی ہے۔

نسیم احمد۔ دادا ابا! آپ نے تو مجھے اس قدر باتیں تعلیم دے دی ہیں کہ اب تو مجھے پکا یقین ہو گیا ہے کہ کل ماسٹر صاحب کا انعام مجھ سے کوئی چھین نہیں سکے گا۔ بس دُعا کیجیے گا کہ مجھے یہ سب کچھ یاد بھی رہ جائے اور کہیں پر اٹک نہ جاؤں تو ساری محنت اکارت ہو جائے گی۔

دادا ابا۔ نہیں بیٹیا! اٹکنے کیوں لگے۔ خوب جم کے اور بے دھڑک تقریر کرنا۔ اور دیکھو ڈرنا اور جھینپنا ہرگز نہیں۔ جو لڑکے علمی باتوں میں ڈر جاتے ہیں یا جھینپنے لگتے ہیں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

نسیم احمد۔ اچھا دادا ابا! اب میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ جواب دینے میں اور تقریر کرنے میں کبھی نہیں ڈروں گا اور قرآن کی قسم جو جو باتیں ماسٹر صاحب پوچھیں گے تڑا تڑ ان کا جواب دوں گا۔

دادا ابا۔ نسیم بیٹے! دیکھو! تمہیں میں کئی بار تنبیہ کر چکا ہوں کہ بلا ضرورت تم قسم نہ کھایا کرو۔ اب پھر میں تم کو سمجھاتا ہوں کہ بار بار اور گھڑی گھڑی قسم کھانے

سے اللہ کے پاک نام یا قرآن مجید یا دوسرے مقدس ناموں کی توہین ہوتی ۔ ایسے شخص کی جو بلا ضرورت قسمیں کھاتا ہو خود اللہ اور رسول نے بھی مذمت فرمائی ہے اس لئے اب میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آئندہ قسمیں کھا کر بات کرنا بالکل چھوڑ دو۔

نسیم احمد۔ دادا ابا! اب میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں قرآن کی قسم ۔ قسمیں کھا کر بات نہیں کروں گا۔ ہائیں ہائیں! بھئی کیا لڑکا ہے ! پھر قسم کھائی ۔ اور کہتا ہے ، قسم کھا کر بات نہیں کروں گا۔

دادا ابا! میں پھر توبہ کرتا ہوں ۔ منہ سے نکل گئی ۔ میں نے جان کے تھوڑی قسم کھائی تھی ۔ اصل میں دادا ابا! میرے کلاس کے ساتھی بات بات میں واللہ اور خدا کی قسم قرآن کی قسم اور فلاں کی قسم اور فلاں کی قسم کھاتے رہتے ہیں تو سن سن کے مجھے بھی یہ بری عادت پڑ گئی اور میرے منہ سے بھی قسم نکل جاتی ہے ۔ بے خبری میں ۔ حالانکہ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے کتنی مرتبہ مجھے اس پر ٹوکا ہے ۔ بس اب نہیں بھولوں گا دادا ابا! ۔ اور ایک بات اور بھی کہوں ! ۔ پاپا سے آپ میرا نام نہ بتائیے گا ، نہیں تو وہ پھر میرا گھر میں داخلہ بند کر دیں گے اور اس کے بعد بھی نہ معلوم وہ مجھے کیا کیا سزائیں دیں ۔ دادا ابا! وہ بھی تو بہت قسمیں کھاتے رہتے ہیں ۔ جب آفس سے دیر میں آتے ہیں تو امی پوچھتی ہیں کہ تم کہاں تھے تو کہتے ہیں کہ تمہاری جان کی قسم اور تمہارے سر کی قسم میں اوور ٹائم کر رہا تھا اس لئے دیر ہو گئی تو امی کہتی ہیں کہ بس معلوم ہو گیا کہ تم آفس میں نہیں کہیں اور تھے اسی لئے تو تم نے جان کی قسم کھائی ہے کیونکہ ایک میری ہی جان تو تمہاری نگاہوں میں کھٹکتی رہتی ہے کہ میں مر جاؤں تو تم دوسری کر لاؤ اسی لئے تو تم بس میری ہی جان کی قسم کھاتے رہتے ہو تو

آپ پاپا کو بھی تو منع کیجئے کہ وہ قسمیں نہ کھایا کریں اور پھر وہ میری امی کی جان کی کیوں قسم کھاتے ہیں اگر خدانخواستہ میری امی مر گئیں تو میں انھیں کہاں سے لاؤں گا۔

دادا ابا۔ بیٹے !' یہ بات ٹھیک ہے۔ میں تمہارے پاپا کو منع کر دوں گا۔ مگر ایک بات یاد رکھو گھر کی باتیں باہر نہیں بیان کرتے ہیں دوسرے کسی کی غیبت یعنی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرتے ہیں اور تیسری بات یہ ہے کہ اس قسم کی قسمیں ہیں تو یقیناً بری مگر ان سے مرتا ورتا کوئی نہیں ہے۔ یہ وہم کبھی دل میں نہ لاؤ۔ وہ باپ ماں کی باتیں ہیں تمہارا اان میں کیا دخل ہے !۔ مگر میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ تم کسی کی بھی تقلید نہ کرو چاہے وہ کلاس کے ساتھی ہوں یا کوئی اور ہو۔

نسیم کی والدہ۔ امی جان ! کیا نسیم یہاں تو نہیں آیا ہے ! صبح سویرے اسکول گیا تھا۔ چار بج گئے ابھی تک نہیں آیا۔ انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ کہیں پتہ نہیں۔ نہ معلوم کدھر نکل گیا۔ صبح کو ذرا سا ناشتہ کر کے گیا تھا بھوکا پیاسا ہے معلوم نہیں کہیں کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا ! کہ آپ کے یہاں بھی دیکھ لوں۔ کہیں یہاں تو نہیں آ گیا ہے۔ کئی روز سے کہہ رہا تھا کہ دادا ابا اور دادی اماں کے پاس عرصہ سے نہیں گیا ہوں وہ سب مجھے یاد کرتے ہوں گے۔

دادی اماں۔ ہاں دلہن ! بہو مراد ہے، تمہارا لڑکا دوپہر سے دادا کے پاس ہے۔ گھبراؤ نہیں بیٹی۔ وہ اسے اسکول کا کچھ سبق یاد کرا رہے ہیں۔

نسیم کی والدہ۔ امی جان ! اس نے کھانا نہیں کھایا ہے

دادی اماں۔ بیٹی مجھے کیا معلوم تھا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا ہے ۔۔ ارے سنتے ہو صاحب ! تمہارے پوتے نے کھانا نہیں کھایا۔ پڑھائے چلے جاتے ہیں اور

لڑکے سے پوچھا بھی کہ تم نے کھانا نہیں کھایا ہے یا نہیں واہ، واہ، واہ۔ اچھی پڑھائی ہے!

دادا ابا۔ ہائیں نسیم! تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا اور مجھے بھی خیال نہ رہا باتوں میں کہ پوچھ لیتا۔ جاؤ جلدی کھانا کھاؤ۔ دیکھو پھر سُن لو اور یاد رکھو ہر کام اس کے وقت پر کیا کرو۔ پڑھائی اپنے وقت پر اور کھانا اور دوسری ضروری باتیں اپنے اپنے وقت پر۔ جو لوگ اوقات کی پابندی نہیں کرتے ان کی صحت اور تمام کام خراب رہتے ہیں۔ جاؤ کھانا کھاؤ!۔

بھئی سنتی ہو!۔ واقعی مجھے بھی خیال نہ رہا کہ لڑکے سے پوچھ لیتا۔ اچھا اب اسے جلدی سے کھانا کھلادو۔ جب تک میں کچھ اور ضروری کام لوں۔

نسیم احمد نے کھانا کھایا۔ دادی اماں نے بہت سی چیزیں کھلائیں، مٹھائی بھی دی۔ نسیم پیٹ بھر کر پھر دادا ابا کے پاس آگئے۔

دادا ابا۔ آؤ بیٹے! کھانا کھالیا۔ بھوکے تو نہیں رہے! نہیں دادا ابا خوب پیٹ بھر گیا کہ اب تو بیٹھا نہیں جاتا۔ خیر اتنا کہاں کھایا ہوگا مگر آئندہ سے ایسی حرکت نہ کرنا۔

اچھا نسیم بیٹے! میں تم کو لفظ "اللہ" کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔

نسیم احمد۔ جی ہاں دادا ابا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ "اللہ" حقیقی معبود کو کہتے ہیں اور بتوں کے لئے اسے صرف مجازی طور پر بول دیا جاتا ہے صرف اس مناسبت سے کہ مشرک لوگ ان کو اپنا حقیقی معبود سمجھتے ہیں حالانکہ ان کا یہ اعتقاد بالکل غلط اور باطل ہے اور "کلمۂ طیبہ" میں یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ کوئی حقیقی معبود ہو ہی نہیں سکتا

سوائے اللہ کے۔

دادا ابا:- اب بیٹے تمہیں میں یہ بتاتا ہوں کہ "الٰہ" تو صرف صفتی نام ہے اللہ کا یعنی ایک ایسی ہستی جو حقیقی معبود ہونے کی حیثیت رکھتی ہو اس کے بعد رہا جو اللہ" کا لفظ تو یہ اسم ذات ہے جسے عربی زبان میں ہم عَلَم اور انگریزی میں Proper noun کہا جاتا ہے۔

نسیم احمد:- دادا ابا! یہ بھی تو بتا دیجئے کہ اللہ" کا لفظ جو ہے تو اس کے لفظی معنی کیا ہیں اور اس لفظ کا مادہ کیا ہے؛ ویسے یہ تو آپ نے بتا دیا کہ یہ خدا کا اسم ذات اور "یہ پراپر ناؤن" ہے مگر اس لفظ کے بھی تو کچھ معنی ہوں گے اور اس کا کچھ مادہ بھی تو ہوگا!۔

دادا ابا:- بیٹے تم نے بڑا گہرا اور بہت پیارا سوال کیا ہے شاباش شاباش! دیکھو میاں! پہلی بات تو یہ ہے کہ بہت سے بڑے بڑے علماء کا یہ خیال ہے کہ یہ" اسم جامد" ہے یعنی یہ لفظ کسی مادہ سے نہیں بنا ہے اور خود ہی ایک مستقل لفظ ہے اور صرف خدا کی ذات ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔ مگر بعض لوگ اس بات کی طرف بھی گئے ہیں کہ یہ مشتق" ہے یعنی کسی مادہ سے بنایا گیا ہے۔ پھر باہم اختلاف ہوگیا، علماء کے درمیان، کہ اس کا مادہ ہے کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی اصل" الٰہ" ہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ اس کی "اَلْاِلٰہ" اور عربی زبان کے قاعدوں کے مطابق" بدل کر" اللہ" ہوگیا۔ اچھا! بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا مادہ "اُلُوہِیَۃ" یا "اُلُوھَۃٌ" ہے جس کے معنی عبادت کے ہیں۔ چونکہ اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اس وجہ سے اس کو اس نام سے پکارا جاتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں یہ لفظ" وَلَہٌ" سے بنا ہے جس کے معنی

حیرانی کے ہیں چونکہ اللہ کی ذات کی معرفت حاصل کرنے میں عقلیں حیران ہیں اس وجہ اس کی ذات کو اس نام سے پکارا جاتا ہے اور بیٹا اسی طرح اس میں بہت سے قول ہیں علماء کے ہیں کہاں تک بیان کروں پھر کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لفظ یعنے "اللہ" سریانی زبان کا ہے اور کچھ کہتے ہیں یہ عبرانی زبان کا ہے یعنی عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔

نسیم احمد۔ دادا ابا! یہ سریانی اور عبرانی زبانیں کیا ہیں۔

دادا ابا۔ ہاں بیٹیا! تم نے اچھا سوال کر لیا۔ شاباش۔ دیکھو! بعض لوگوں نے بتایا ہے کہ "سُریانہ" ایک جزیرہ کا نام ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام رہا کرتے تھے اس لئے اُن کی زبان اور ان کی اولاد کی زبان "سریانی" مشہور ہو گئی اور یہ وہی زبان ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے وہ خود اور ان کی تمام اولاد بولتی رہی یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا تو وہ اور ان کی اولاد بھی یہی زبان بولتی تھی۔ رہی عبرانی زبان تو یہ وہ زبان ہے جو بنی اسرائیل بولتے تھے اور اب بھی یہودی اسی زبان کو بولتے ہیں۔ غرض "اللہ" کا لفظ بعض علماء کے نزدیک سریانی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ عبرانی ہے مگر علماء اور مفسروں کی اکثریت کے نزدیک یہ قول درست نہیں ہے۔ یہ بھی میں تم کو بتائے دیتا ہوں۔ بلکہ حقیقت یہی ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ اسم ذات الٰہی ہے اور اس سے مراد وہ خاص ہستی ہے جس نے تمام کائنات کو پیدا کیا اور وہی سب کو رزق دینے والی اور زندگی و موت دینے والی ہے۔ نسیم بیٹے یہاں تک تو میں نے تمہیں، بعض لفظوں کا مطلب

بنایا۔ اب سنو کہ کلمۂ طیبہ" میں سب سے پیشتر لَا اِلٰہ" کا جملہ آتا ہے۔ اس کے معنی تو تم کو یاد ہی ہیں؛

نسیم احمد۔ جی دادا ابا! یاد ہیں یعنی۔ کوئی معبود نہیں" ٹھیک! شاباش!

دادا ابا۔ یہاں تم نے ایک بات پر کبھی غور کیا۔ دیکھو "کلمۂ طیبہ" میں سب سے پیشتر ہر معبود کی نفی کر دی گئی ہے پھر کہا جاتا ہے "اِلَّا اللہ" سوائے اللہ کے تو اس کلام میں بڑا زور پیدا ہو گیا اور مطلب یہ ہوا کہ جب ہم اپنے دل سے یہ بات نہ نکال ڈالیں کہ اللہ کے سوا کوئی بھی اصلی اور حقیقی سرچشمۂ طاقت، سرچشمۂ رزق، سرچشمۂ اقتدار و بزرگی نہیں ہے اور اس کا یقین نہ کر لیں کہ عظمت و عزت و جلالت کا اصلی مالک صرف اللہ ہے اور جس کو بھی کچھ عزت و بزرگی ملتی ہے وہ اللہ ہی عطا فرماتا ہے اس وقت تک ہم سچے توحید پرست نہیں ہو سکتے۔

تو بیٹے! میرا مطلب یہ ہے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" میں دو باتیں جمع کر دی گئی ہیں ایک تو انکار ہے اور دوسرے ہے اقرار۔ ایک بات کی نفی ہے اور دوسری بات کا اثبات ہے ایک جگہ "نہیں" ہے اور دوسری جگہ "ہاں" ہے آجتک یہ "ہاں" اور "نہیں" "نفی" و "اثبات" اور اقرار و انکار ساتھ ساتھ نہ ہوں گے "کلمۂ طیبہ" مکمل نہیں ہو سکتا جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ کی معبودیت کا بھرپور اقرار ہو اور اس اقرار کے ساتھ ہی ساتھ اس کے غیر کی معبودیت کا انکار اور نفی بھی ہو۔ تو حاصل یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص اللہ کی معبودیت کے اقرار کے ساتھ کسی دوسرے یا دوسروں کو بھی معبود جانتا ہو اور ان کی بھی پرستش کرتا ہو تو وہ سچا مومن اور موحّد نہیں ہو سکتا۔ سچا موحّد صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو صرف اللہ ہی کو معبود جانتا ہو اور اس کی خدائی اور معبودیت

میں اس کے غیر اور اس کے سوا کسی اور کی خدائی اور معبودیت کا ذرا سا بھی شائبہ نہ پیدا ہونے دے۔

اس طرح لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے سے جاہل انسانوں کے بنائے ہوئے اور مانے ہوئے تمام چھوٹے اور بڑے اور ہر قسم کے خداؤں کی معبودیت باطل ہو جاتی ہے اور اصلی توحید کے معنی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ساتھ ہی ان لوگوں کے عقیدہ کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ اس کی خدائی میں کچھ اور ہستیوں کو بھی شریک سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دو یا تین ہستیاں آپس میں مل جل کر خدا بن جاتی ہیں یا کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں جن میں خدا سمایا ہوا ہے۔ غرض نسیم بیٹے! یہ سارے کے سارے عقیدے اسلام کی اس مکمل اور خالص توحید کے سامنے باطل اور غلط ہو جاتے ہیں اور پھر چونکہ "اللہ" اسم ذات ہے اور اس سے مراد وہ کامل و اکمل ہستی ہے جو ہر نقص اور عیب سے پاک ہو اور جس میں ہر کمال بدرجۂ کمال موجود ہو اور وہ کسی کی احتیاج بھی نہ رکھتی ہو اور سب سے بے نیاز ہو، جو ازلی اور ابدی ہو جو سب کو پیدا کرنے والی یعنی اپنے حکم سے خلق کرنے والی ہو اور خود اس کو کوئی خلق کرنے والا نہ ہو اور جس کو کبھی فنا نہ ہو۔ یہ سب صفتیں ہوں، بیٹے! جس میں وہی "اللہ" ہے تو اس سے خود بخود ہمیں یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ نہ تو اس کا کوئی والد ہے، نہ اس کی کوئی والدہ ہے اور نہ اس کا کوئی لڑکا یا لڑکی ہے۔ اور نہ اس کی کوئی بیوی ہے غرض یہ سب باتیں اس کی شانِ معبودیت کے خلاف ہیں اور اسی وجہ سے اس کو اس عظیم نام سے پکارا جاتا ہے یعنی "اللہ" کے نام سے۔

نسیم بیٹے! یہ تو بہت تھوڑی سی باتیں میں نے تم کو بتائی ہیں "اللہ" اور "لا

اِلٰہ اِلَّا اللہ" کے متعلق مگر اس سے تم کچھ نہ کچھ اس کا مطلب ضرور سمجھ گئے ہو گے ،

نسیم احمد۔ دادا ابا! آپ نے تو مجھے بہت کچھ بتا دیا ۔ یہ تو سمندر ہے سمندر جو کوزہ میں آپ نے بھر دیا ہے ۔ اب تو میں آپ کی دعا سے ایسی تقریر کروں گا کہ میرے ساتھی کیا خود ہمارے ماسٹر صاحب بھی اُش اُش کرنے لگیں گے بلکہ میرے ساتھی تو دادا ابا! شرمندگی سے عرق عرق ہو جائیں گے اور آپ کا نام خوب ہی روشن ہوگا اور میری بھی بڑی تعریف ہوگی اور پھر انعام بھی ملے گا ۔ مگر پتہ نہیں دادا ابا! ماسٹر صاحب نے کیا انعام رکھا ہے دینے کے لئے ۔ خدا کرے کوئی لمبا انعام ہو ۔ کہیں وہ کوئی سکنڈ ہینڈ کیا ؤتاب نہ پکڑا دیں کہ بس لو یہ ہے تمہارا انعام !

دادا ابا۔ نسیم میاں ! اللہ سے دعا کرو وہی کامیابی دینے والا ہے اور دیکھو پہلے منصوبے زیادہ نہ بنایا کرو ۔ کام کرنے کی بھرپور کوشش کیا کرو اور غرور و تکبر کی بات بالکل نہ کیا کرو ۔ پھر علم کو علم کے لئے حاصل کرنے کی کوشش کرو نہ کہ مقابلہ کے لئے یا کسی دنیوی فائدہ کے لئے ۔ جو لوگ ان مقاصد کے لئے تحصیل علم کرتے ہیں انھیں کبھی علم نہیں ملتا ۔ پھر اگر تم کو انعام ملا بھی اور انعام میں سکنڈ ہینڈ کوئی اچھی کتاب ہی ملی تو اس میں کیا خرج ہے ۔ بیٹے کتاب سے بڑھ کر تو کوئی بھی بڑا انعام نہیں ہو سکتا ۔ یہ سب باتیں بیٹے ! اپنے دل سے نکال دو اور کبھی ان باتوں کے لئے تحصیل علم نہ کرنا ۔ یاد رکھو تحصیل علم کی غرض نہ تو سند حاصل کرنا ہے ، نہ نوکری لینا ہے اور نہ کوئی انعام و اکرام اور نہ کسی کی تعریف و تحسین اس کی غرض ہے بلکہ تحصیل علم کی غرض صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے صحیح معنی میں انسان بننا ، اپنے اللہ اور رسولؐ کو پہچاننا اور ان کے احکام پر عمل کرنا اور ساتھ ہی اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنا اور ان تمام فرائض کو

پورا کرنا جو حقوق اللہ کے ساتھ ہی حقوق العباد سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

اب نسیم بیٹے! ایک بات اور تم کو بتاتا ہوں کہ جب ہمارے خالق نے ہمیں عقل دی ہے سمجھ عطا کی ہے تو یہ بات بھی ضروری تھی کہ وہ ہمیں ان تمام باتوں کی تفصیل بھی سمجھادے جو ہمارے لئے بری اور ہمارے نقصان کا سبب ہیں اور وہ باتیں بھی بتادے جو ہمارے لئے اچھی اور ہمارے فائدہ کی ہیں تاکہ ہم اپنی عقل سے کام لے کر اچھی باتوں کو اختیار کریں اور بُری باتوں سے بچیں۔ بس یہی تو وجہ تھی کہ ہمارے اللہ نے اپنے رحم وکرم سے ہماری ہدایت کے لئے یعنی ہمارے نفع اور نقصان کی تمام باتوں کی تفصیل بتانے کے لئے کچھ پاک دپاکیزہ انسانوں کو مقرر کیا جنہوں نے ہرزمانہ میں ہم تک اللہ کے پیغام اور اس کے احکام پہنچائے۔ بس بیٹے نسیم! یہی پاک انسان نبی اور رسول کہلاتے ہیں۔ نبی کی جمع انبیاء ہے اور رسُول کی جمع "رُسُل" آتی ہے۔ اچھا رسول کو مُرسَل بھی کہتے ہیں پھر مُرسَل کی جمع "مرسلین" ہے۔ جو عربی زبان کی گرامر کے قاعدوں کے مطابق کبھی کبھار "مُرسلون" بھی پڑھا جاتا ہے۔ یعنی کبھی اسے "ی" کے ساتھ پڑھتے ہیں اور کبھی "واو" کے ساتھ یعنی گرامر کے لحاظ سے جیسا کچھ موقع ہوگا اسی کے مطابق پڑھیں گے۔

نسیم احمد۔ دادا ابا! ۔ ہاں بیٹے! ایک بات یہ بھی بتا دیجئے کہ نبی اور رسول میں کچھ فرق ہے یا دونوں کے معنی ایک ہی ہیں،

دادا ابا۔ شاباش بیٹے! بڑا اچھا سوال ہے! اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ نے کچھ انسانوں کو منتخب فرما کر ان پر اپنے منشا اور اپنے احکام کو ظاہر کر دیا ہے ایسے لوگ نبی بھی کہلاتے ہیں اور رسول بھی۔ بس فرق یہ ہے کہ نبی وہ برگزیدہ

ہستیاں ہیں جن کو اللہ اپنی شریعت اور اپنے دین کی تعلیم تو دیتا ہے۔ مگر انھیں خاص طور پر کسی قوم کی طرف اس دنیا کی تبلیغ کے لئے مقرر نہیں کرتا بس لوگ ان کے کردار اور نیک سیرت سے سبق حاصل کرتے رہتے ہیں۔ بھئی دیکھو! یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شہر میں کوئی نیک آدمی ہو اور وہاں کے لوگ اس کی نیک زندگی سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ لیکن ایک وہ آدمی ہوتا ہے جسے گورنمنٹ اس شہر کا افسر مقرر کر دیتی ہے اور اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اچھی باتیں کرنے کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے اور جو اس کی باتوں کو نہ مانے اُسے سزا دے غرض ایک تو وہ شخص ہوتا ہے جو گورنمنٹ کی طرف سے باقاعدہ افسر مقرر کر دیا جاتا ہے اور دوسرا وہ ہوتا ہے جو افسر مقرر نہیں ہوتا مگر لوگوں کو فائدہ اس سے بھی پہنچتا رہتا ہے۔ بس اسی طرح سمجھو کہ "نبی" بھی ایک برگزیدہ اور پاک و پاکیزہ انسان کا نام ہے مگر وہ کسی قوم کی خاص طور پر تبلیغ کرنے اور ہدایت کرنے پر اللہ کی طرف سے مقرر اور معین نہیں ہوتا اور "رسول" اس کو کہتے ہیں جو اس تبلیغ و ہدایت کے کام کے لئے مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر "رسول" تو نبی ضرور ہی ہوتا ہے۔ مگر ہر نبی رسول نہیں ہوا کرتا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ نبی پر وحی آتی ہے اور خواب میں فرشتوں کی آوازیں سنتا ہے اور انھیں دیکھتا بھی ہے مگر جاگتے ہیں انھیں نہیں دیکھتا لیکن "رسول" فرشتوں کو جاگنے کی حالت میں بھی دیکھتا ہے اور ان سے اسی طرح باتیں کرتا ہے جیسے ہم آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ سمجھ گئے نسیم! یہ تو ہوا فرق نبی اور رسول میں۔ اب سنو کہ کچھ "رسول" تو وہ ہیں جنہیں اللہ کی جانب سے خود شریعت عطا ہوئی تھی اور وہ اسی کی تبلیغ کرتے رہے۔ جیسے آدم علیہ السلام اور حضرت نوح و ابراہیم علیہما السلام اور کچھ وہ "رسول" جو کسی دوسرے "رسول" کی شریعت کی تبلیغ کرنے

پر مقرر تھے جیسے حضرت لوط علیہ السلام کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی تبلیغ فرماتے ہیں، اسی کے ساتھ بیٹا! یہ بھی یاد رکھو کہ کچھ ایسے بھی رسول گزرے ہیں جن کی شریعت نے کسی اگلے نبی کی شریعت کو منسوخ کر دیا تھا یعنی کچھ تھوڑی سی فروعی باتوں میں اللہ کے حکم سے تبدیلی کر دی گئی تھی تو ایسے تمام رسولوں کو ہی "اُولوالعزم" رسول کہتے ہیں اور یہ ہیں پانچ۔ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور ان سب میں بھی ہمارے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سب ہی سے افضل ہیں اور آپ کی شریعت اب قیامت تک باقی رہے گی یعنی اب قیامت تک نہ تو کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی رسول آئے گا۔

تو بیٹے یہ ہوئی تفصیل "محمد رسول اللہ" جو کلمۂ طیبہ کا دوسرا فقرہ ہے۔

نسیم احمد:۔ دادا ابا! بس ایک بات اور بتا دیجئے "محمدؐ" جو حضور نام نامی ہے

دادا ابا:۔ بیٹے! یہ کیا مشکل بات ہے۔ یہ لفظ تو "حمد" سے بنا ہے۔ حمد کہتے ہیں تعریف کرنے کو اور "محمد" کے معنی ہوئے وہ ہستی جو انتہا درجہ کی لائق تعریف و توصیف ہو تو اس طرح حضور کی ذاتِ اقدس بھی ویسی ہی جیسا آپ کا اسم گرامی تھا یعنی بے حد قابلِ تعریف اور بے انتہا لائق توصیف۔ غرض خلاصہ یہ ہوا کہ "کلمۂ طیبہ" میں ہیں تو فقط دو ہی جملے مگر اسلام کا جو کچھ پیغام ہے وہ سب اس کے اندر موجود ہے۔ توحید کا نظریہ بھی پورے کمال کے ساتھ ہے اور رسالت بھی اپنی پوری جامعیت کے ساتھ موجود ہے اور بیٹے! تم تو بڑے سمجھ دار لڑکے ہو۔ تم ضرور یہ بات سمجھ گئے ہو گے کہ جب کوئی شخص حضورؐ کی رسالت کا اقرار کرے گا تو یقیناً اس کے اس اقرار کرنے کے ساتھ ہی ان تمام باتوں کا خود بخود اقرار ہو جائے گا جن کی حضورؐ نے تعلیم دی اور جو کچھ حضور اپنے ساتھ لائے

ہیں اور پھر اس میں قیامت کے دن کا اقرار، جنت و دوزخ کا وجود اور سزا و جزا کا اقرار اور اسی طرح قرآن پاک کے معجزہ ہونے کا اعتقاد اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ یہ ساری ہی باتیں آجائیں گی اور یہ ضرورت باقی نہ رہے گی کہ الگ الگ ہر بات پر اعتقاد کا اعلان کیا جائے۔ اور سنو! بیٹے اس میں امامت و خلافت کا بیان بھی آگیا۔

نسیم احمد۔ بیشک دادا آبا! پھر الگ الگ باتوں کے اقرار کی کیا ضرورت رہی وہ تو سب ہی باتیں اتنے سے جملہ میں خود ہی آگئیں۔ ٹھیک ہے دادا آبا! بالکل ٹھیک ہے۔ میں بالکل سمجھ گیا۔

دادا آبا۔ بس بیٹے! کلمۂ طیبہ" پر اس قدر باتیں میں نے تم کو سمجھا دی۔ ان کو خوب یاد کر لو۔ انشاء اللہ تمہارے ماسٹر صاحب تمہارے منھ سے یہ یہ سب کچھ سن کر بڑے ہی خوش ہوں گے۔ اب بیٹے! مجھے عصر کی نماز پڑھنا ہے اور تم گھر جاکر ان سب باتوں کو خوب غور سے بار بار دیکھنا اور یاد کر لینا۔ اچھا نسیم بیٹے! بہت اچھا دادا آبا۔ اب میں جا رہا ہوں آداب۔ جیو بیٹے خدا حافظ۔

نسیم احمد گھر آگئے۔ رات کو خوب مطالعہ کیا اور صبح سویرے ناشتہ کر کے جلدی جلدی اسکول روانہ ہو گئے اور سب سے پہلے کلاس میں جاکر آگے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ پھر ماسٹر صاحب بھی آگئے اخّاہ! نسیم صاحب آج تو بڑے سویرے آگئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "کلمۂ طیبہ" پر خوب تیاری کر لی ہے۔

نسیم احمد۔ سر! بس کچھ تھوڑا ہی دیکھ سکا ہوں۔ زیادہ وقت تو مل نہ سکا کہ بھرپور تیاری کر سکتا۔ خیر جو کچھ بھی ممکن ہو گا وہ عرض کر دوں گا۔ کلاس ذرا سی دیر میں بھر گیا۔ ماسٹر صاحب نے یہ دیکھ کر کہا:۔

ماسٹر غلام رسول۔ بچو! یاد ہے تم کو کل میں نے کسی بات کا اعلان کیا تھا۔

بچے۔ جی ہاں سر! بالکل یاد ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ "کلمۂ طیبہ" پر ہم سے تقریریں کرائیں گے تو ہم لوگ بھی خوب تیار ہو کر آگئے ہیں۔ تقریریں شروع ہوئیں بعض تقریریں بہت خراب تھیں کہ ماسٹر صاحب کو کہہ دینا پڑا۔ ہاں ہاں! ٹھیک ہے بس بیٹھ جاؤ۔ کچھ نسبتہً بہتر تھیں۔ بالآخر نسیم احمد کا نمبر آ ہی گیا۔

ماسٹر صاحب۔ نسیم احمد!

نسیم احمد۔ جی حاضر!

ماسٹر صاحب۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔

بس یہ سنتے ہی نسیم احمد نے ایک گھن گرج تقریر کر دی کہ سارا کلاس سناٹے میں آگیا اور ماسٹر بھی ہکّا بکّا رہ گئے۔

ماسٹر صاحب۔ بھئی نسیم احمد! آج تو تم نے کمال کر دیا۔ کیا تقریر کی ہے۔ واہ، واہ! ۔کیا عمدہ بیان ہے اور کیسی اچھی باتیں تم نے بیان کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے والدین بڑے قابل ہیں مگر تم خود بھی بڑے ہی سمجھ دار ہو کیونکہ اگر تم میں قابلیت نہ ہوتی تو یہ باتیں تم کو یاد کیسے رہتیں اور تم ایسی اعلیٰ درجہ کی تقریر کیسے کرتے بھئی کمال کر دیا آج تو تم نے۔ کیا کہنا! شاباش! مرحبا! میں تو تمہارے والدین اور سرپرستوں کو مبارکباد دینے آؤں گا۔ اور لو یہ نئی کتاب لو اور یہ ایک ہاتھ کی گھڑی بھی لو اور یہ پچاس روپیہ کیش ہیں یہ بھی لو۔ کلاس میں تالیوں کا ایک شور مچ گیا۔

اور پھر چھٹی ہو گئی۔ نسیم دوڑتے ہوئے، ہاتھ پر گھڑی لگائے جیب میں پچاس روپے کا نوٹ لئے اور کتاب کو بستے میں رکھے ہوئے جلدی سے پہلے" دادا

ابا، کے پاس آئے۔ سانس پھولی ہوئی تھی بات منھ سے نکلتی نہ تھی۔

نسیم - دادا ابا! یہ دیکھئے گھڑا! ارے لاحول ولا قوۃ - یہ دیکھئے گھڑی اور یہ فوٹ اور یہ کتاب۔ یہ سب دادا، آپ ہی کی جوتیوں کا طفیل ورنہ میں اس قابل کہاں تھا! اب لائیے، آپ بھی! وہی انعام! ہاں ہاں میں بھی دوں گا۔ اور چیخ کر دادی اماں! میں آگیا۔ یہ گھڑی، یہ فوٹ اور یہ کتاب اور دادی اماں! پالا مار لیا۔ سارے انعام مجھ ہی کو مل گئے اور اب لائیے آپ اپنا انعام بھی۔ میں تو آپ سے انعام لے ہی کے جاؤں گا۔ دادی اماں نے بڑھ کر پوتے کو گلے سے لگالیا۔

سورۃ النّاس

عام ھدایات

(۱) بورڈ پر خاص لفظوں کے معنی پہلے سے لکھ دیجئے۔
(۲) ایک ایک طالبعلم سوال کرے۔ اکھٹا سب نہ بولیں۔
(۳) سورۃ النّاس کو لہجہ سے پڑھا جائے۔ بلکہ جب کسی سورت کی تلاوت ہو تو لہجہ ہی سے ہو۔
(۴) کہیں اگر ضرورت ہو تو ایک بات کو تکرار کے ساتھ بیان کیا جائے یعنی اسے بار بار کہا جائے تاکہ سننے والوں کے ذہن نشین ہو جائے۔

آج بچو! ہمارے اسکول میں ایک ماہانہ جلسہ ہونے والا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ ہمارے یہاں مہینے میں ایک بار طلبہ کا جلسہ ہوا کرتا ہے جس میں لڑکے نعت خوانی اور تقریر کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔

کیوں بچو! تمہیں یہ بات معلوم ہے؟ بچے: جی ہاں سر! ہم سب جانتے ہیں۔ آج کے دن اسکول کے ختم ہونے پر جلسہ ہوگا۔

ماسٹر صاحب: تو دیکھو جس وقت تم لوگ جلسہ میں جانا تو بڑے صبر و سکون سے اپنی اپنی سیٹ (نشست) پر بیٹھ جانا اور پورے نظم و ضبط اور کامل توجہ کے ساتھ جلسہ کی کاروائی کو سنتے رہنا۔ آپس میں بلاوجہ باتیں نہ کرنا اور جلسہ کی کاروائی کے درمیان اگر ضروری بات کسی سے کہنا ہو تو چپکے سے اور تہذیب و ادب کے ساتھ کہنا۔ بچو! یوں تو ہمیں ہر وقت ہی ادب اور تہذیب کا خیال رکھنا چاہیئے۔ وہ بچے اچھے نہیں سمجھے جاتے جو بلاوجہ باتیں کرتے ہوں۔ بغیر کسی سبب کے ہنستے رہتے ہوں اور اگر کبھی کوئی دوسرا کسی کے ساتھ بات کر رہا ہو تو خود بیچ میں بولنا شروع کر دیں اور اس کی بات کو کاٹ دیں۔ غرض تم سب ان باتوں کا خیال رکھنا۔ دیکھو بچو! جلسہ میں باہر کے لوگ بھی آجاتے ہیں۔ اگر وہ ڈسپلن یعنی نظم و ضبط کے خلاف کوئی بات دیکھیں گے تو تمہاری بدنامی کے ساتھ تمہارے اسکول کی بھی بدنامی ہوگی۔

بچے: سر! ہم لوگ آپ کی نصیحتوں پر پوری طرح عمل کریں گے اور ہرگز ہرگز آپ کو شکایت کا موقع نہ دیں گے۔ ماسٹر: شاباش!

دیکھو بچو! یہ اسکول ہی تو ہوتا ہے جہاں سے تہذیب اور علم حاصل کر کے بچے نکلتے ہیں اور پھر ملک اور قوم ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ اگر یہاں تم لوگ تہذیب نہ سیکھو گے تو پھر تم کو کون تہذیب اور ادب سکھائے گا پھر اگر خود تم ہی کو ادب نہ آتا ہوگا تو تم دوسروں کو ادب کیسے سکھاؤ گے۔

ماسٹر صاحب: اچھا بچو! دیکھو اب چھٹی کی گھنٹی ہونے ہی والی ہے۔ تم سب جلسہ میں جانے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ مگر یاد رکھنا کہ نظم و ضبط کی پابندی میں فرق نہ آنے پائے!

چھٹی کی گھنٹی بجی: ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن۔ ہر کلاس کے بچے نکلنے لگے اور جلسہ گاہ کی طرف بڑے نظم و ضبط اور خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گئے اور اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جلسہ کا آغاز کلام پاک سے ہوا۔ ایک بچے نے بڑے اچھے لہجہ میں سورۂ الناس کی تلاوت کی:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیم۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

قُل اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِکِ النَّاسِ ۝ اِلٰہِ النَّاسِ ۝ مِن شَرِّ الوَسوَاسِ ۝ الخَنَّاسِ ۝ الَّذِی یُوَسوِسُ فِی صُدُورِ النَّاسِ ۝ مِنَ الجِنَّۃِ وَالنَّاسِ ۝

صَدَقَ اللّٰہُ العَظِیم وَصَدَقَ رَسُولُہُ النَّبِیُّ الکَرِیم۔

ایک بچہ (شاہد) ماسٹر صاحب سے : سَر اس لڑکے نے یقیناً مصر کے قاریوں کے ٹیپ ریکارڈ سے مشق کی ہے جب ہی تو اتنی اچھی طرح اور ایسے اچھے لہجہ میں اسنے تلاوت کی۔

ماسٹر صاحب : شاہد ! ہو سکتا ہے تمہارا خیال صحیح ہو مگر ہمارے پاکستان میں بھی کیا کم اچھے قاری ہیں ! ایک سے ایک اچھا پڑھنے والا موجود ہے !۔ سر! اب میں بھی خوب مشق کروں گا اور آئندہ مہینے کے جلسہ میں آپ مجھ کو موقع دلوا دیجئے گا تو میں اس سے بھی اچھی تلاوت کروں گا۔

ماسٹر صاحب : کاش تم سب بچوں میں یہی جذبہ پیدا ہو جائے کہ قرآن پاک کو صحیح طریقہ پر اور اچھے لہجہ میں پڑھو بلکہ پورا قرآن حفظ کرو اور اس سے بھی زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ اس کے معنیٰ اور مطلب کو بھی سمجھو۔

شاہد : سَر ! یہ تو بڑی ضروری بات ہے کہ ہم قرآن پڑھتے وقت یہ بھی تو سمجھیں کہ ہمارے منہ سے کیا بات نکل رہی ہے اور جس کلام الٰہی کو ہم پڑھ رہے ہیں اس کا مطلب کیا ہے ! مگر سر! ہوتا یہ ہے کہ بہت سے لوگ تو جانتے ہی نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے ۔ بیٹے ! تم نے بڑی اچھی بات کہی اور اس پر ستم یہ ہے کہ جو لوگ معنی بھی جانتے ہیں اُن

میں سے بہت کم ہی ایسے ہوں گے جو اس پر عمل کرتے ہوں۔

شاہد: سر! یہی تو وجہ ہے کہ مسلمان کی اخلاقی حالت ہر ملک میں انتہائی خراب ہو چکی ہے اور اخلاقی ہی کیا۔ اقتصادی، سماجی اور سیاسی ہر حیثیت سے سر! مسلمانوں کی عزت ختم ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے جو آپ نے بیان کی ہے۔

ماسٹر صاحب: اچھا شاہد تم بھی اور تمہارے سب ساتھی کل جب کلاس میں آئیں گے تو میں اسی سورۃ الناس کا ترجمہ اور مطلب بیان کروں گا اور تم میں سے ہر ایک کو اس کی اجازت ہوگی کہ اس کے متعلق وہ جو سوال چاہے کرے اور میں کوشش کروں گا کہ اسے مطمئن کر دوں۔

دوسرا روز ہوا۔ کلاس میں طلبہ جمع ہو گئے۔ استاد نے ٹیپ ریکارڈ سے سورۃ الناس کی تلاوت سنائی اور کہا۔ بچو! تم نے تلاوت دوبارہ سن لی۔ لو اب اس کا ترجمہ بھی سنو: "اے رسول کہہ دو کہ میں انسانوں کے پروردگار کی، انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں شیطان کے شر سے (وہی شیطان) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے ہو۔"

بچو! تم نے اس کا ترجمہ سن لیا؟ جی ہاں سر! سن لیا۔ اب تم بتاؤ کہ اس میں کون کون سی بات تمہاری سمجھ میں آئی اور کون سی بات

سمجھ میں نہیں آئی۔

شاہد : سر! ایک بات تو میری سمجھ میں یہ آئی کہ ہمارے دلوں میں جو برے برے خیالات اور طرح طرح کے بے اصل وہم پیدا ہوتے ہیں وہ دراصل شیطان ہی ہمارے دلوں میں ڈالتا ہے تو اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ جب بھی ہمارے دل میں کوئی ایسی فضول بات آئے تو ہم اللہ کو یاد کرلیں اور اُس سے پناہ طلب کریں تو وہ برے برے خیالات ہمارے دلوں سے دور ہو جائیں گے۔

ماسٹر صاحب: شاباش شاہد! تم نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اور کوئی سوال!

ایک لڑکا: سر! میں یہ پوری طرح سمجھ گیا کہ ہم جو گمراہ ہوتے ہیں وہ شیطان کی بات مان کر اور اس کے راستہ پر چل کر گمراہ ہوتے ہیں اور ہمیں ہدایت اُسی وقت مل سکتی ہے جب ہم اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں اور اس کی پناہ حاصل کریں پھر میں یہ بھی سمجھا ہوں کہ اس سورت میں اللہ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ وہی انسانوں کا پروردگار یعنی پالنے والا، ان کا اصلی بادشاہ اور ان کا حقیقی معبود ہے۔ اُسی کی ذات اِس کا حق رکھتی ہے کہ ہم اس کے سامنے عبادت کیلئے اپنا سر جھکائیں اور اس کے علاوہ کوئی بھی معبود ہونے کا حق نہیں رکھتا۔

استاد: بیٹے سلیم! تم نے بھی بڑی اچھی بات بیان کی واقعی تم لوگوں نے اس سورت کے ترجمہ کو بہت غور سے سنا ہے۔

ایک اور بچہ: سر! میں نے یہ بات بھی سمجھ لی ہے کہ صرف اللہ ہی ہمارا معبود اور پروردگار ہے یعنی وہ وحدہ لاشریک ہے۔ نہ تو کوئی دوسرا ان صفتوں کا مالک ہے اور نہ اللہ کے ساتھ اس کی بادشاہت میں کوئی اس کا شریک ہو سکتا ہے۔

ایک بچہ شمس الدین: سر! کچھ لفظوں کا مطلب سمجھا دیجئے۔

کون سے لفظ؟ بچو! شمس الدین کے اس کہنے پر مجھے ایک بات یاد آگئی جس کی طرف میں تم سب کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جب بھی تم کو کوئی بات معلوم نہ ہو تو ہمیشہ اس کو کسی سے دریافت کر لو اور کبھی نہ شرماؤ کہ اگر ہم کسی سے اس کو پوچھیں گے تو وہ سمجھے گا کہ ہم جاہل ہیں۔ دیکھو بچو! علم خود بخود نہیں آتا پوچھنے اور سیکھنے ہی سے آتا ہے۔ اس لئے میری اس نصیحت کو یاد رکھنا کہ جو بات تمہیں معلوم نہ ہو اس سے جاہل رہنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اسے کسی جاننے والے سے پوچھ کر معلوم کر لو چاہے وہ تم سے بڑا ہو یا چھوٹا ہو اس طرح تم جہالت سے محفوظ رہو گے اور تمہارا علم بڑھتا رہے گا۔ کسی نامعلوم بات کو دریافت کرنا بڑی اچھی عادت ہے اور نہ معلوم کرنا اور

دریافت کرنے سے شرمانا بہت بڑا عیب ہے۔ جو بعض اوقات آدمی کو بڑی سخت شرمندگی اور بڑے نقصان اور بدنامی میں مبتلا کرتا ہے۔ اس لئے ہاں! شمس الدین بتاؤ وہ کون سے لفظ ہیں جن کو تم پوچھنا چاہتے ہو۔

شمس الدین: سر! ایک تو یہ بات معلوم کرنا تھی کہ اس سورت میں اللہ نے "ربّ النّاس، مَلِکِ النّاس، اِلٰہِ النّاس" کیوں فرمایا ہے؟ سر! میرا مطلب یہ ہے کہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اللہ انسانوں ہی کا پروردگار اور ان ہی کا بادشاہ اور ان ہی کا معبود ہے حالانکہ وہ تو سارے جہاں کا پروردگار اور بادشاہ اور معبود ہے تو یہ صرف انسانوں ہی کا کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ شمس الدین بیٹے! یقیناً یہ بات دریافت کرنے کی تھی۔ دیکھو بات یہ ہے کہ انسان کو تمام کائنات سے اللہ نے افضل و اشرف بنایا ہے جیسے تم اس طرح کہتے ہو کہ انسان اشرف المخلوقات یعنی تمام مخلوقات سے اعلیٰ اور اشرف ہے تو جب وہ انسان کا پروردگار اور بادشاہ اور معبود ہے تو پھر ظاہر ہے کہ جو مخلوقات انسان سے کم درجہ کی ہے اس کا معبود اور بادشاہ تو ضرور ہی ہوگا اس وجہ سے یہاں صرف انسانوں کا ذکر کیا گیا اور جو اس سے نیچے درجہ کی مخلوق ہے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ پھر شمس الدین ایک بات اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ اس جگہ پر چونکہ صرف انسان کے بچاؤ کی بات کی گئی ہے اسلئے اللہ کی صفتوں کے ذکر میں بھی محض انسانوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بچو! سمجھ گئے؟

جی ہاں سر! ہم بالکل سمجھ گئے۔ شمس الدین کے ساتھ سب ہی بول اٹھے۔ اچھا سر! ایک بات یہ بھی بتادیجئے کہ "وَسْواس" کے کیا معنی ہیں؟

ہاں بیٹے دیکھو! "وَسْواس" اور "وَسْوَسہ" ایک ہی چیز ہے یعنی برے برے خیالات اور طرح طرح کے توہمات کا دل میں آنا۔ اسے وسوسہ اور وَسْواس کہتے ہیں مگر یہ یاد رکھنا کہ یہاں پر خود کوئی برا خیال اور وہم مراد نہیں ہے بلکہ اس وہم کا پیدا کرنے والا اور دل میں ڈالنے والا مراد ہے یعنی شیطان۔

سر! آپ کو تکلیف تو ہو گی! ایک لفظ کے معنی اور بتا دیجئے۔

کیا؟ شمس الدین: سر! "خنّاس" کے کیا معنی ہیں۔ دیکھو شمس الدین! خنّاس اس کو کہتے ہیں جو سُکڑ جانے والا اور سمٹ جانے والا اور پیچھے ہٹ جانے والا ہو چونکہ شیطان اللہ کا نامِ پاک سنتے ہی پیچھے کی طرف بھاگنے لگتا ہے اس لئے اُس کو "خنّاس" کہتے ہیں۔ سر! میں بالکل سمجھ گیا۔

تمام لڑکے: سر! ہم سب بھی سمجھ گئے۔

ایک اور بچہ! سر! ایک بات مجھے بھی پوچھنا ہے۔ تم بھی پوچھ لو محمد اشرف! کیا پوچھنا چاہتے ہو!۔ سر! شیطان تو ہوا وہ جو گمراہ کرتا ہے دلوں میں برے برے خیال ڈالتا ہے اور جب اللہ کا نام سنتا ہے تو بھاگنے لگتا ہے تو کیا شیطان جِنوں اور انسانوں دونوں میں ہوتا ہے؟

دیکھو اشرف بیٹے! ایک تو شیطان یعنی ابلیس وہ ہے جس کا ذکر حضرت

آدم علیہ السلام کے واقعہ میں اللہ نے کیا ہے۔ یہاں مراد خود وہ ابلیس نہیں ہے بلکہ وہ تمام گمراہ کرنے والی ہستیاں مراد ہیں جو اُسی شیطان اور اسی ابلیس کی طرح گمراہی کا کام کرتی ہیں اور ایسی سرکش ہستیاں جنوں میں بھی ہیں اور انسانوں میں بھی ہیں مگر آدمی جب اللہ کا نام لے کر اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے لو لگاتا ہے تو اس کا دل فوراً ان شیطانوں کی گمراہی سے پاک ہو کر ہدایت کے راستہ پر آجاتا ہے۔ تم یہاں ایک بات اور بھی یاد رکھنا کہ لوگ غلطی سے "اَجِنَّۃ" کہہ کر جنات کو مراد لیتے ہیں۔ یہ غلط ہے بلکہ "اَجِنَّۃ" "جَنِین" کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں وہ بچہ جو اپنی ماں کے شکم کے اندر ہو اور "جن" کی جمع "جِنَّۃ" آتی ہے جس کے معنی جنات کے ہیں۔ اب تو میرا خیال ہے کہ تم لوگ سورہ النّاس کے مطلب کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے۔

شاہد اسکول کی چھٹی کے بعد گھر پہنچے تو لگے بڑی بہن پر رعب جمانے۔ باجی فرزانہ! بتاؤ "خنّاس" کسے کہتے ہیں اور "وسواس" کے کیا معنی ہیں؟۔

فرزانہ: اچھا تو آج آپ بڑی شان سے تشریف لا رہے ہیں!۔ یہ وسواس، خنّاس کہاں سے سیکھ گئے۔ ارے جناب آپ پہلے اس کے معنی بتائیے پھر دوسری بات کیجئے گا۔

فرزانہ: شاہد! کہیں تم خود ہی تو اس سے مراد نہیں ہو! بس معلوم ہو گیا کہ آپ کو کچھ نہیں معلوم ہے۔ لیجئے میں بتائے دیتا ہوں۔ ٹھہرو شاہد! تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ میں نے یہ لفظ پڑھے ہیں۔ سورۃ الناس کے ہیں۔ خناس شیطان کے لئے بولا گیا ہے۔ پیچھے ہٹنے والے کو کہتے ہیں اور وسواس سے مراد شیطان ہے جو دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

فرزانہ: بس رہ گئے شاہد صاحب! بڑے آئے پوچھنے والے! مجھے یہ سب پہلے سے معلوم تھے۔

باجی تم تو بڑی استاد نکلیں میں تو یہ سمجھا تھا کہ آج میں تم کو ہرادوں گا۔

فرزانہ: اچھا شاہد! یہ تو بتاؤ کہ آج اسکول میں کیا پڑھایا گیا تھا؟ یہ بات تم نے مجھ سے کیسے پوچھی؟ شاید آج اسی کا سبق دیا گیا تھا۔

ھاں باجی! آج ماسٹر صاحب نے ہم سب کو سورۃ الناس کا مطلب بتایا تھا۔ اصل میں کل اسکول میں جلسہ ہوا تھا تو وہاں ایک لڑکے نے اسی سورت کی تلاوت کی تھی تو آج کلاس میں بس یہی سبق کا موضوع تھا۔

فرزانہ: اچھا شاہد جب ہی جانوں کہ تم مجھے آج کے سبق کا خلاصہ بتادو۔

شاہد: ابھی بتائے دیتا ہوں وہ کیا مشکل ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ ہی تمام جہاں اور تمام انسانوں کا بادشاہ، پروردگار اور معبود ہے

اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے یعنی اس کا نہ کوئی ہمسر ہے اور نہ کوئی شریک ہے، دوسری بات یہ ہے کہ جنوں اور انسانوں میں ایسی ہستیاں موجود رہتی ہیں جو بقیہ انسانوں کو گمراہ کرتی رہتی ہیں اور اُن کے دلوں میں طرح طرح کے برے خیالات ڈالتی رہتی ہیں مگر جب انسان اللہ کا نام لیتا ہے اور اس کی ذات کی طرف رجوع کرتا اور اس سے لو لگاتا ہے تو وہ گمراہیاں مٹ جاتی ہیں اور انسان ہدایت کے راستہ پر آجاتا ہے اور وہ شیطان ناکامیاب ہو جاتے ہیں۔

فرزانہ: شاہد واقعی تم نے سبق کو بڑے غور سے سنا ہے۔ اب کبھی تم شیطان کے پھندے میں نہ پھنسنا۔ اچھا شاہد! ایک بات اور بھی یاد رکھو کہ اس سورت میں دلوں سے برے برے خیالات کو نکالنے کا ذکر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عمل کی برائی دراصل خیالات ہی سے شروع ہوا کرتی ہے۔ پہلے تو دل میں برا خیال ہی آتا ہے نا! پھر اس خیال میں طاقت آجاتی ہے اور انسان اسی کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے۔ اگر دل سے پہلے ہی برے خیال کو نکال دیا جائے تو انسان کبھی کوئی برا کام نہ کرے، اسی لئے اللہ نے فرمایا ہے کہ تم اپنے دلوں کو ہمیشہ برے خیالات اور وسوسوں سے پاک رکھا کرو۔ واقعی باجی فرزانہ! آپ نے تو بڑے پتہ کی بات کہی اور واقعی جو کچھ آپ نے کہا وہ بالکل صحیح ہے۔ ✶

سورۃ والعصر

عام ہدایات :

۱۔ اساتذہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ بورڈ پر یہ لکھ دیں کہ جس وقت قرآن کی تلاوت ہو، تمام طلبہ ادب سے بیٹھیں اور تلاوت اور اس کے ترجمہ کو خاموشی، ادب اور غور سے سنیں اور ایک دوسرے سے باتیں نہ کریں۔

۲۔ لفظ "عصر" (زمانہ) کے معنی نیز لفظ "خسر" (گھاٹا) عمل صالح (عمل نیک) کے معنی اسی طرح "تواصی" (ایک کا دوسرے کو نصیحت کرنا) یہ سب معنی بورڈ پر پہلے سے لکھ دیں۔

۳۔ فیچر سننے کے بعد طلبہ سے دریافت بھی کریں کہ وہ اس سے کیا سمجھے اور چند طلبہ کو بیان کرنے کا موقع دیں۔

سلطانہ : بھائی جان آپ نے اتنے زور سے ریڈیو کھول دیا

کہ گھبرا کے میری آنکھ کھل گئی۔ ابھی تو بھائی جان بڑا سویرا ہے۔ صبح تڑکے تو ویسے ہی نیند بڑے زور کی اور بڑی میٹھی آتی ہے پھر میں تو رات بڑی دیر میں سوئی تھی۔ محلہ میں ایک شادی تھی وہاں بہت دیر ہو گئی کوئی ایک بج گیا تھا جب وہاں سے میں آئی تھی۔

بھائی جان: خیر اچھا اب تو سلطانہ تمہاری آنکھ کھل ہی گئی۔ مجھے بڑا افسوس ہے۔ اُٹھ کر دیکھو تو سلطانہ! قاری صاحب کتنے اچھے لہجہ میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آسمان سے آواز آ رہی ہے۔ صبح کا سہانا سماں ہے۔ سلطانہ یہ آواز کیسی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بس دل کے اندر اُتر تی ہی چلی جا رہی ہے۔ ہاں بھائی جان! آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں یہ آواز سن کر تو اب میری نیند بالکل غائب ہو گئی۔ ذرا آواز اور تیز کر دیجئے۔ بھائی جان! میں نسیم کو بھی جگائے دیتی ہوں، یہ تو بے حد سوتا ہے۔ جب سارا گھر اٹھ بیٹھتا ہے تو آپ اٹھتے ہیں اور بس ایسا لگتا ہے کہ جیسے اٹھتے کیا ہیں کہ پورے گھر پر احسانِ عظیم کرتے ہیں۔ اچھا میں اب اسے جگاتی ہوں۔

سلطانہ: نسیم صاحب بس اٹھ بیٹھئے، صبح ہو گئی! دیکھو ریڈیو سے

کیسی اچھی آواز میں کوئی قاری صاحب کلام پاک کی تلاوت کر رہے ہیں۔
اٹھو اٹھو! بس اب ہوشیار ہو جاؤ!

نسیم : سلطانہ باجی! میں خوش قسمتی سے آپ کے اٹھنے سے بیشتر ہی سے جاگ رہا ہوں۔ میں نے آپ کی ساری باتیں سن لی ہیں اچھا خیر! ان باتوں کو تو رہنے دو۔ اب تم سیدھے ہو کر بیٹھ جاؤ اور دیکھو ریڈیو سے کیسی اچھی آواز آرہی ہے۔ سلطانہ! واقعی بھائی جان ایک تو اللہ کا کلام ہے پھر اس لہجہ سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام آسمان و زمین سے یہی آواز آرہی ہے۔ بھائی جان اب قاری صاحب نے کیا ایک سورت ختم کر کے دوسری سورت شروع کر دی؟ ہاں بیٹی اب یہ سورۃ والعصر کی تلاوت کر رہے ہیں۔ کیا اس تلاوت کے بعد اس کا ترجمہ بھی بیان ہو گا۔ ہاں سلطانہ اس کے بعد ترجمہ بھی بیان کیا جائیگا۔ قاری صاحب نے تلاوت شروع کر دی۔

اَعوذ باللہ مِنَ الشیطان الرَّجیم۔ بسم اللہ الرَّحمٰن الرَّحیم
وَالعَصرِ ۙ اِنَّ الاِنسَانَ لَفِی خُسرٍ ۙ اِلَّا الَّذِینَ
اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوا بِالحَقِّ ۙ٥ وَتَوَاصَوا
بِالصَّبرِ ٥ صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبیّ الکریم۔

بھائی جان اب اس کے بعد اس کا ترجمہ بیان ہو گا؟ ہاں بیٹی خاموشی

سے سنتی رہو۔ اب ترجمہ بیان ہوتا ہے۔

سلطانہ: نسیم تم سو تو نہیں رہے ہو دیکھو اب سورۃ والعصر کا ترجمہ بیان ہونے والا ہے۔ پوری توجہ سے سننا۔ باجی بس آپ ہی تو جاگتی ہیں اور آپ کو سارا زمانہ سوتا ہی نظر آتا ہے! سلطانہ اچھا بگڑو نہیں نسیم! چپکے ہو کر سنو!

"قسم ہے زمانہ کی۔ بے شک انسان بڑے خسارہ میں ہے۔ مگر وہ لوگ خسارہ میں نہیں ہیں جو سچے دل سے ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کئے۔ اور آپس میں ایک دوسرے کو حق باتوں کی نصیحت کرتے رہے اور صبر کرنے کی تاکید کرتے رہے۔"

سلطانہ: بھائی جان! ترجمہ تو میں نے سن لیا مگر کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ نسیم! تمہاری سمجھ میں بھی کچھ آیا۔ یا ابھی نیند ہی میں ہو۔ تم تو ناشتہ کی اسکیم بنا رہے ہو گے۔ پھر یہ اسکیم بناؤ گے کہ کون سا ایسا چلتا ہوا عذر تلاش کروں کہ اسکول نہ جانا پڑے! باجی! آپ تو ہمیشہ میرے لئے اسی طرح کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ نسیم بھیا! میں جو کچھ کہتی ہوں تمہاری محبت میں کہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سویرے اٹھو، نماز پڑھا کرو۔ وقت پر منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرو صاف ستھرے کپڑے پہنو اور پھر اسکول جاؤ۔ محنت سے پڑھو۔

سستی سے کام نہ لیا کرو۔ وقت کو بیکار ضائع نہ کیا کرو۔ ایک ایک منٹ کو غنیمت سمجھو تاکہ تم ایک سچے انسان اور سچے مسلمان کی طرح زندگی بسر کرو اور دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کرو۔ میری یہ باتیں اس وقت تو تم کو ضرور بری معلوم ہوتی ہیں لیکن بھیا تم کو ان باتوں کی قدر اس وقت ہوگی جب تم بڑے ہو کر اصلی زندگی میں داخل ہو گے۔

بھائی جان: نسیم! تم سلطانہ کی باتوں کا برا نہ مانو وہ جو کچھ کہتی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اچھا اب اس بحث کو ختم کرو اور سورۂ والعصر کے مطلب پر غور کرو اور جو جو باتیں تم دونوں کی سمجھ میں نہ آئی ہوں وہ دریافت کرو تاکہ میں تمھیں اس کا مطلب پوری طرح سمجھا دوں۔

سلطانہ: بھائی جان! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی وہ مجھے بتا دیجئے۔ ہاں سلطانہ! کون سی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آئی؟ بھائی جان یہ بتایئے کہ یہ جو اللہ نے فرمایا ہے کہ عصر یعنی زمانہ کی قسم اس کا کیا مطلب ہے؟ اور عصر کسے کہتے ہیں۔ ہاں بہن تم نے بڑا اچھا سوال کیا۔ اس کے جواب سے تمھیں بڑے کام کی باتیں معلوم ہوں گی۔ دیکھو! یہ تو تمھیں معلوم ہی ہو چکا ہے کہ عصر کے معنی "زمانہ" کے ہیں۔ یوں سمجھو کہ دن رات کے آنے جانے اور منٹوں، گھنٹوں دنوں، راتوں، ہفتوں، مہینوں اور سالہا سال کے گزرتے رہنے کو

زمانہ کہتے ہیں اور کبھی اس کے لئے ہم "وقت" کا لفظ بھی بولتے ہیں جو زمانہ گزر جاتا ہے اس کو ہم ماضی کہتے ہیں، جو آئے گا اسے مستقبل اور جو موجود ہے اس کو زمانۂ حال کہتے ہیں۔ دیکھو سلطانہ بہن! یہ زمانہ ہی تو ہے جس کی وجہ سے بچہ، جوان ہو جاتا ہے اور جوان بوڑھا ہو جاتا ہے۔ جاہل، عالم بن جاتا ہے، کمزور قوی اور قوت دار کمزور ہو جاتا ہے۔ پھر دیکھو اگر یہ زمانہ نہ ہوتا یعنی دن رات کی گردش، ان کا آنا جانا نہ ہوتا تو ایک چھوٹا سا دانہ بڑھ کر ایک بڑا درخت کیسے بن جاتا اور اس میں پھول اور پھل کیسے نکل سکتے اور چھوٹے چھوٹے بیجوں سے یہ لہلہاتے ہوئے کھیت کس طرح پیدا ہو جاتے۔ تو یہ سب کچھ زمانہ ہی کی وجہ سے تو ہوتا ہے۔ اب تو سلطانہ! تمہاری سمجھ میں پوری طرح یہ بات آگئی ہوگی کہ زمانہ یعنی وقت بڑی قیمتی چیز ہے اور ہمیں چاہیئے کہ اللہ نے زمانہ کے ایک ایک لمحہ میں جو فائدوں اور کامیابیوں کے خزانے بھر دیئے ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں اور ان کو فضول باتوں میں برباد نہ کر دیں۔

سلطانہ: نسیم! سن رہے ہو تم بھائی جان کی یہ سب باتیں!۔ اب معلوم ہوا کہ زمانہ اور وقت کس قدر قیمتی چیز ہے اور ہم کو اس کا ایک لمحہ بھی برباد نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اگر ہم اس کو برباد کریں گے تو

اس سے خود ہم ہی کو نقصان پہنچے گا اور اگر ہم اس سے فائدہ اٹھائینگے تو کامیابیاں ہمیشہ ہمارے قدم چومتی رہیں گی۔ دنیا میں جتنے بڑے آدمی گذرے ہیں۔ بھائی جان! انھوں نے کبھی اپنے وقت کو برباد نہیں کیا ہوگا ورنہ وہ ہرگز بڑے آدمی نہیں بن سکتے تھے۔ بیشک سلطانہ! انھوں نے ہمیشہ وقت کی قدر کی اور اسی لئے وہ ہمیشہ کامیاب رہے۔ اس کا مطلب بیٹی یہ ہوا کہ آدمی کا یہ فرض ہے کہ وہ وقت کی عظیم نعمت کو مناسب طریقہ پر استعمال کرے مثلاً پڑھنے کے وقت پڑھے اور کھیل کے وقت کھیلے، ورزش کے وقت ورزش کرے، سونے کے وقت سو جائے اور جاگنے کے وقت جاگ جائے۔ غرض جس کام کا جو وقت مناسب ہو اسے اسی وقت انجام دے اور بیکار اور فضول باتوں میں ایک لمحہ بھی برباد نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ پڑھنا شروع کیا تو صحت کی خبر نہ رہی۔ سونا شروع کیا تو بس سوتے ہی رہے اور باتیں کرنے پر آئے تو بیکار کی باتوں میں گھنٹوں برباد کر دیئے اور کھیلنے پر اتر آئے تو بس کھیلتے ہی رہے۔ یاد رکھو کہ جو آدمی وقت کی قدر نہیں کرتا یعنی ہر کام کو وقت پر نہیں کرتا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا اور پھر وقت بھی اس کی قدر نہیں کرتا۔

نسیم: بھائی جان! یہ بات تو میری بھی سمجھ میں اب خوب آ گئی ہے۔

اب میں بھی روزانہ صبح کو وقت پر اٹھوں گا اور ہر کام وقت پر کروں گا بھائی جان!
دیکھو سلطانہ بیٹی! اللہ نے زمانہ کی قسم اسی لئے تو کھائی ہے کہ ہم اس کی اہمیت کو سمجھیں اور ہماری عقل میں یہ بات پوری طرح آجائے کہ زمانہ اور اسی وقت پر ہی تمام ترقیاں موقوف ہیں۔

سلطانہ: بھائی جان! یہ بات تو میری بھی سمجھ میں اب اچھی طرح آگئی ہے۔ اب ایک بات اور بتائیے۔ یہ "خُسر" کا کیا مطلب ہے؟

بھائی جان: بیٹی! اس کے معنی "خسارہ" کے ہیں۔ "خسارہ" گھاٹے کو کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص تجارت میں کچھ پونجی یعنی سرمایہ لگاتا ہے اور اس کی تجارت فیل ہو جاتی ہے اور اس کا جو اصلی سرمایہ ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے یا اس میں گھاٹا پڑ جاتا ہے تو اسے عربی میں "خسارہ" کہتے ہیں۔ غرض اللہ نے ہمیں اس کی تعلیم دی ہے کہ جو لوگ وقت کو برباد کر دیتے ہیں یا اس کا غلط استعمال کرتے ہیں وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہیں گے اور دنیا و آخرت کی کامیابیوں سے بالکل محروم ہو جائیں گے اس کے برخلاف کامیابی ان ہی لوگوں کے قدم چومے گی جو ایمان لانے والے ہیں اور نیک عمل کرنے والے ہیں۔ بیٹی سلطانہ! اسے یاد رکھو کہ ایمان اور عملِ صالح کا مطلب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی اللہ اور رسولؐ کو پہچانے اور اُن کے احکام پر عمل کرے اور اپنے

وقت کا کوئی حصہ بھی ان باتوں میں نہ لگائے جو اللہ کے حکم کے خلاف ہوں۔ اللہ نے ہمیں جن باتوں کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرنے میں ہمارا ہی تو فائدہ ہے اور عمل نہ کرنے میں ہمارا ہی نقصان ہے۔ اگر ہم دنیا میں ایک بڑے کامیاب انسان بننے کے خواہشمند ہیں تو پھر ہمیں وہی کرنا چاہیئے جس کا اللہ نے والعصر کی مبارک سورت میں ہمیں حکم دیا ہے۔ ہم ہمیشہ اللہ کو یاد رکھیں۔ ہمیشہ نیک کام کرنے کی کوشش کریں... مصیبتوں اور پریشانیوں میں کبھی نہ گھبرائیں بلکہ بڑے صبر و سکون سے کام لیں۔ بے صبری اور بزدلی کو اپنے قریب نہ آنے دیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ ہم خود بھی ان باتوں پر عمل کریں اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیں کیونکہ ایک اچھے اور بھلے آدمی اور ایک سچے مسلمان کا یہ فریضہ ہونا چاہیئے کہ وہ بھلی باتوں پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کو بھی حسن اخلاق اور تہذیب و محبت کے انداز میں اچھی اچھی نصیحتیں کرے اور بھلی باتوں کی تعلیم دے۔

اچھا بھئی اب تم دونوں آدمی بتاؤ کہ اس سورۂ والعصر سے تم لوگ کیا سمجھے؟ بس مختصر لفظوں میں جواب دو تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ تم نے اس کا مطلب خوب سمجھ لیا ہے۔

سلطانہ: بھائی جان! میں تو اسے اچھی طرح سمجھ گئی کہ وقت

بڑی قیمتی چیز ہے ۔ اسے ہم کبھی برباد نہ کریں ۔ ایک ایک لمحہ ہمارے لیئے دینی اور دنیوی کامیابیوں کا ایک بڑا خزانہ ہے اور جو وقت چلا جاتا ہے پھر وہ کبھی ہاتھ نہیں آسکتا ۔

بھائی جان: نسیم ! اور تم نے کیا سمجھا ۔ بھائی جان ! میں بھی سلطانہ باجی کی بھرپور تائید کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ روزانہ سویرے اٹھا کروں گا اور ہر کام وقت سے کروں گا ۔

فیچر

سورۃ البقرۃ کا آخری رکوع

ٹن ٹن ...... ٹھیک ۷ بج گئے۔ کلاس میں سوائے دو ایک طلبہ کے سب حاضر ہیں اور کچھ بھاگتے ہوئے آرہے ہیں۔ کلاس ٹیچر نے طلبہ کی حاضری نوٹ کی اور طلبہ سے خطاب کیا:۔

شریف الدین: دیکھو بھئی آج ہے تمہارا سبق! جانتے ہو کیا ہے؟

طلبہ: نہیں سر! ہمیں نہیں معلوم۔ آپ خود ہی بتایئے۔

شریف الدین: دیکھو! آج کا سبق یہ ہے جو میں بورڈ پر لکھ رہا ہوں۔ ارے! ارے! یہ دیکھو......

طلبہ: سر! یہ تو قرآن مجید کی آیت معلوم ہوتی ہے۔ ایسا ہی تو زیر زبر قرآن میں بھی لگا رہتا ہے۔

شریف الدین: ہاں بھئی۔ تمہارا خیال صحیح ہے یہ قرآن پاک ہی کی آیتیں ہیں۔ ارے! دیکھو اب میں اس کے نیچے یعنی ہر سطر کے نیچے

اس کا ترجمہ بھی لکھے دیتا ہوں۔ دیکھو یہ ..... ترجمہ بھی لکھ دیا۔
کیا تم کو معلوم ہے کہ یہ قرآن پاک میں سے کس جگہ کی آیتیں ہیں۔

طلبہ : نہیں سر!

شریف الدین : دیکھو! میں یہ بھی لکھے دیتا ہوں۔ یہ ..... میں نے لکھ دیا اسے تم خود پڑھو!

طلبہ : سورۂ بقرۃ کا آخری رکوع پارہ ۳

شریف الدین : ہاں ہاں بالکل ٹھیک! یہ سورۂ بقرۃ کا آخری رکوع ہے۔ دیکھو اب میں اس کی تلاوت کرتا ہوں اور ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی بیان کروں گا۔ خوب غور سے سننا۔ پھر بچو! میں اس کے کچھ خاص لفظوں کی تشریح اور ان کے معنی بھی بتاؤں گا اور آخر میں یہ بتاؤں گا کہ ان آیتوں کا مفہوم کیا ہے۔ اچھا اب ادب سے بیٹھ جاؤ اور سنو۔

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطانِ الرَّجِیمِ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط

اللہ ہی کا ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ

یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ط اور اگر تم لوگ ان باتوں کو

ظاہر کردو جو تمہارے دلوں میں ہیں یا انہیں چھپائے رکھو ہر صورت میں اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط

پھر جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا سزا دیگا۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط رسول یعنی پیغمبر اُس چیز پر ایمان لائے جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ان پر اتاری گئی ہیں اور سب مومن بھی اس پر ایمان لے آئے۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ قف

سب کے سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئے۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف (وہ لوگ کہتے ہیں) کہ ہم اللہ کے پیغمبروں میں باہم کوئی فرق نہیں کرتے (یعنی سب ہی کو اللہ کا پیغمبر جانتے ہیں) وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۔ اور کہتے ہیں کہ ہم نے (سب کچھ) سن لیا اور اُسے مان لیا۔ ہم تیری بخشش کے

امیدوار ہیں اے ہمارے پالنے والے! اور تیری ہی طرف ہمیں واپس جانا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط اللہ نہیں تکلیف دیتا کسی شخص کو مگر جس قدر اس شخص میں قوت و طاقت ہوتی ہے (یعنی طاقت سے زیادہ اللہ کسی کو کسی بات کا حکم نہیں دیتا) وہ شخص جو اچھا کام کرے گا اس کا فائدہ اسی شخص کو ملے گا اور اگر اس نے برا کام کیا تو اس کا وبال بھی اسی پر پڑے گا (یعنی اللہ کے حکم پر عمل کرنے میں خود انسان ہی کا فائدہ ہوتا ہے اور اس کے خلاف کام کرنے میں خود انسان ہی کا نقصان ہوگا۔) رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا۔ اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہماری گرفت نہ فرمانا یعنی ہمیں اس پر سزا نہ دینا اور ہمیں معاف کر دینا۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا بوجھ تو نے ہم سے پہلے گذر جانے والوں پر ڈالا تھا۔ رَبَّنَا وَلَا

تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ وقفہ ۔ اے ہمارے پروردگار! جس بوجھ کو اٹھانے کی ہم میں قوت نہ ہو اُسے ہم سے نہ اٹھوانا اور ہم سے درگذر کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا حاکم ہے تو کافروں کے مقابلے میں تو (اے اللہ) ہماری مدد فرما۔

شریف الدین: بچو! تم نے خوب غور سے سب کچھ سن لیا۔ دیکھو ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کیسی اچھی اچھی باتیں فرمائی ہیں اور بھئی یوں تو سارے قرآن میں سب اچھی ہی باتیں ہیں۔ اگر ہم ان باتوں پر عمل کریں تو کیسے اچھے انسان بن جائیں کیوں بچو! ٹھیک ہے نا؟

بچے: جی ہاں سر! بالکل ٹھیک ہے۔ اگر ہم ان باتوں پر عمل کریں گے جب ہی اچھے انسان اور سچے مسلمان بن سکتے ہیں۔

شکیل: سر! یہ تو بتائیے کہ آیت کسے کہتے ہیں اور رکوع کیا ہوتا ہے یہ تو ہمیں معلوم ہی نہیں!۔

شریف الدین: شاباش۔ اچھا سوال کیا تم نے۔ (کلاس کی طرف خطاب کرکے) تم لوگوں میں سے اگر کسی کو یہ بات معلوم ہو تو بتاؤ۔

طلبہ۔ سر! یہ تو ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں!۔

شریف الدین: سنو! پورے قرآن میں کل ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتیں ہیں ان میں سے ہر سورت کو کئی طرح سے تقسیم کیا گیا ہے ایک بڑی تقسیم ہے اور ایک سب سے چھوٹی تقسیم ہے۔ سب سے بڑی تقسیم کے جو حصے ہیں انہیں ہم رکوع کہتے ہیں اور جو سب سے چھوٹی تقسیم ہے اور اس میں جو چھوٹے چھوٹے حصے ہوتے ہیں انہیں ہم آیت کہتے ہیں۔

شاہین: سر! دو تین لفظیں ہماری سمجھ میں نہیں آئیں ان کے معنی خوب سمجھا دیجئے۔

شریف الدین: ہاں بیٹی! بتاؤ بتاؤ شاباش۔ وہ کون سی لفظیں ہیں جو تم نہیں سمجھیں؟

شاہین: ایک تو "وُسعٗ" کے معنی بتا دیجئے۔ دوسرے "اِضحیٰ" اور تیسرے یہ کہ یہ "ملائکہ" کیا چیز ہے سر! کیا وہ بھی ہمارے ہی جیسے لوگ ہوتے ہیں؟

شریف الدین:۔ شاہین بیٹی! شاباش شاباش تم نے بڑے ہی

اچھے سوالات کئے ہیں۔ دیکھو میں یہ سب باتیں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ سب بچو! غور سے سنو اور خوب یاد رکھنا۔

دیکھو بھئی! "وُسْعَ" کے معنی تو ہیں طاقت و قدرت و قوت کے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو جن جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ ایسی ہی ہیں جنہیں وہ لوگ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ اللہ نے انہیں اُس بات کے کرنے کا حکم دیا ہو جسے وہ لوگ کر ہی نہ سکتے ہوں اور اس پر عمل کرنے کی طاقت ہی نہ رکھتے ہوں۔ تو آ گیا سمجھ میں تمہاری۔

طلبہ: جی ہاں سر! دوسرا لفظ تم نے پوچھا تھا "اِصْرً" تو اسکے اصلی معنی تو "بوجھ" کے ہیں مگر یہاں مراد ہے ایسا سخت حکم جس پر عمل کرنے میں بڑی ہی شدید مشقت اور سخت تکلیف اٹھانا پڑے۔ اس کے بعد "ملائکہ" کیلئے یاد رکھو کہ یہ ہم جیسی مخلوق کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے مراد نور کی مخلوق ہے۔ اس مخلوق کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنی ہے۔ ملائکہ ہی کو ہم "فرشتے" بھی کہتے ہیں۔ یہ سب ملائکہ یعنی فرشتے "معصوم" ہوا کرتے ہیں یعنی یہ کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور ہمیشہ اس کی عبادت اور اس کے حکم پر عمل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہ تو ہے شاہین بیٹی! تمہارے تینوں سوالوں کا جواب۔ پیارے بچو! یہ سب باتیں تمہاری سمجھ

میں آگئیں؟

طلبہ: جی ہاں سر! ہم سب خوب اچھی طرح سمجھ گئے۔

شریف الدین:۔ پیارے طلبہ! اب میں تمہارے سامنے ان تینوں آیتوں کا خلاصہ بیان کئے دیتا ہوں۔ خوب غور سے سننا اور اچھی طرح یاد رکھنا۔

دیکھو بھئی! پہلی آیت میں اللہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے اس کا اصلی مالک وہ خود ہی ہے پھر یہ بتایا ہے کہ ہم لوگ چاہے کسی بات کو دل میں رکھیں اور چھپائیں یا اسے ظاہر کردیں مگر اللہ ہر بات کو جانتا ہے۔ یعنی ہم اپنی کوئی بھی بات اللہ سے نہیں چھپا سکتے۔ پھر اس نے یہ فرمایا کہ اُسی کو اس بات کا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ ہمیں سزا دے یا معاف کردے۔

دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مومن وہی ہے جو اللہ پر ایمان رکھے اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان رکھے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان تمام باتوں کو حق جانتے ہیں جو اللہ نے انہیں تعلیم دی ہیں اور تمام کتابوں پر جو اللہ نے نازل کی ہیں اور تمام پیغمبروں پر جنہیں اللہ نے بھیجا ہے ایمان رکھتے ہیں۔ پھر یہ سمجھایا گیا کہ مومن وہی ہے جو اس کا بھی یقین رکھے کہ آخر میں اسے اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہوگا۔ تیسری

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو جن جن باتوں کا حکم دیا ہے وہ ایسی ہی ہیں جو لوگوں کی طاقت وقوت سے باہر نہیں ہیں جنہیں وہ کر نہ سکیں بلکہ وہ اسی بات کا حکم دیتا ہے جسے اس کے بندے کر سکیں پھر اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ بندوں کو ہر وقت اللہ سے بخشش کی دعا مانگنا چاہیئے اور اُسی سے مدد طلب کرنا چاہیئے کیونکہ جب تک وہ مدد نہ فرمائے اور رحم نہ کرے کامیابی نہیں مل سکتی۔

اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بجنے لگی ٹن ٹن .....

سب بچے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔

شاہین گھر پہونچ کر اپنی دادی اماں سے :۔

شاہین : دادی اماں! آج کلاس میں ماسٹر صاحب نے ہمیں سورہ بقرۃ کے آخری رکوع کا سبق دیا تھا۔ دادی اماں! اور بڑی اچھی اچھی باتیں بتائیں۔

دادی اماں : قرآن مجید کھولکر۔ دیکھو آخری رکوع یہاں سے یہاں تک ہے۔

جی ہاں دادی اماں! ہاں بیٹی ذرا مجھے بھی سنادو تم نے کیا پڑھا ہے۔

شاہین نے فرفر پورا سبق سنا دیا۔

دادی اماں : شاباش شاباش میری بیٹی بڑی سمجھدار ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔

الکُرسیّ

ماسٹر کبیر الدین : دیکھو بچو! یہ بورڈ پر موٹے موٹے حرفوں میں کیا لکھا ہوا ہے۔

کرامت علی : میں بتاؤں ماسٹر صاحب؟ ہاں بتاؤ۔ یہ لکھا ہوا ہے "آیۃ الکُرسیّ"

محمود، نعیمہ اور سب بچے : ماسٹر صاحب! یہ کون سی مشکل بات تھی جو کرامت نے بتا دی۔ یہ تو ہم سب ہی کو معلوم ہے۔

کبیر الدین : ہاں یہ بات تو تم لوگ صحیح کہتے ہو کہ یہ تم سب کو معلوم ہے کہ بورڈ پر یہ کیا لکھا ہوا ہے مگر کیا تم میں سے کوئی بچہ ایسا بھی ہے جو یہ بتا سکے کہ "آیۃ الکرسی" سے مراد کیا ہے۔

نعیمہ : ماسٹر صاحب! ہماری امّی تو روزانہ رات کو آیۃ الکرسی سوتے وقت پڑھا کرتی ہیں۔

محمود : اور ماسٹر صاحب میری امی بھی۔ اور سنیئے! مجھے تو انہوں

نے خوب رٹا بھی دی ہے۔

کبیر الدین : واقعی محمود تمہیں آیۃ الکرسی یاد ہے۔

محمود : جی ہاں سر! آپ کہیئے تو ابھی سنا دوں۔

کبیر الدین : ہاں بھئی محمود! یہ بات تو تم نے بڑی اچھی بتائی۔ بھلا سنا تو دو دیکھیں کیسی یاد ہے!

محمود نے آیۃ الکرسی کی بڑے اچھے لہجہ میں تلاوت کی۔

نعیمہ : سر! بس امّی بھی اسی طرح پڑھا کرتی ہیں۔

کبیر الدین : بچو! ایک بات سنو۔ دیکھو اب میں تمہارے سامنے آیۃ الکرسی بورڈ پر لکھے دیتا ہوں اور پھر ساتھ ہی اس کا ترجمہ بھی لکھتا ہوں۔ خوب سمجھ لو۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو پوچھ لینا۔ یاد رکھو جو لڑکے ایسی بات پوچھنے میں جھینپتے ہیں اور شرم کے مارے نہیں پوچھتے جو انہیں معلوم نہیں ہوتی وہ ہمیشہ جاہل رہ جاتے ہیں۔ تو تم کو چاہیئے کہ جو بات تم کو معلوم نہ ہو وہ فوراً دریافت کر لیا کرو۔ سمجھ گئے نا! جی ہاں سر! — دیکھو اب میں لکھتا ہوں۔ خوب غور سے دیکھو۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ ۵

اللہ ہی کی ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے، سب کا سنبھالنے والا ہے۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

اس کو نہ تو اونگھ آتی ہے اور نہ اسے نیند آتی ہے۔
لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط کون ایسا ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے۔ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج وہ جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے موجود ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ لوگ اس کی معلومات میں سے کسی بات کو بھی گھیر نہیں سکتے سوائے اس چیز کے جسے وہ خود چاہے۔ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ج وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۔ اس کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اس کی ذات پر ان دونوں یعنی آسمانوں اور زمین کی نگرانی ذرا بھی گراں نہیں ہوتی اور وہی ہے عالیشان بڑی عظمت والا۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت الگ ظاہر ہو چکی

ہے گمراہی سے۔ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ
بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی ق لَا
انْفِصَامَ لَھَا ط وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ تو جو کوئی
معبود باطل یعنی جھوٹے خدا کو نہ مانے اور صرف اللہ پر
ایمان رکھے تو بے شک اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام
لیا جس کے لئے ٹوٹ جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اللہ
بڑا سننے والا، بڑا جاننے والا ہے۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۵
اللہ ہی ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لے
آئے وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال کر لاتا
ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓئُھُمُ الطَّاغُوْتُ لا
یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ط اور جن لوگوں
نے کفر اختیار کیا ان کے سرپرست طاغوت یعنی جھوٹے خدا ہیں
جو انہیں نور سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔
اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔
یہی لوگ دوزخی ہیں جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔
نعیمہ: سارا ترجمہ تو ہم نے خوب غور سے پڑھ لیا ہے

مگر چند باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔

کبیر الدین: شاباش! پوچھو۔ جو باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئی ہیں۔ میں ابھی انہیں سمجھا دوں گا۔

نعیمہ: سر! یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ "کرسی" سے یہاں کیا مطلب ہے۔ کیا ایسی ہی کرسی جس پر ہم لوگ بیٹھا کرتے ہیں؟

کبیر الدین: واقعی تم نے بڑا اچھا سوال کیا۔ دیکھو بیٹی۔ یہاں کرسی سے مراد اللہ کا علم اور اس کی قدرت ہے اور بعض لوگوں نے اس سے مراد ایسا بڑا پھیلا ہوا ایک جسم لیا ہے جو آسمانوں سے بھی بڑا ہے اور اس سے بڑا اگر کوئی جسم ہے تو صرف عرشِ الٰہی ہے۔

کرامت: سر! "سِنَۃٌ" کا کیا مطلب ہے۔ اور نَوْمٌ کسے کہتے ہیں۔

کبیر الدین: ہاں دیکھو میاں "سِنَۃٌ" کے معنی یاد رکھو اونگھنے کو کہتے ہیں اور "نومٌ" سو جانے کے لئے بولتے ہیں۔

محمود: ماسٹر صاحب! دو تین الفاظ اور بتا دیجئے۔ طَاغُوت عُرْوَۃٌ۔ اِنْفِصَامٌ اور وُثْقٰی کے معنی کیا ہیں؟

کبیر الدین: تم نے بہت اچھا کیا جو اِن لفظوں کے معنی دریافت

کرلیے۔ دیکھو بیٹے! "طاغوت" کو سرکش یا شیطان یا جھوٹے خدا کے لئے بولا جاتا ہے یہاں معبودِ باطل یعنی جھوٹے خدا مراد ہیں۔ عُروَۃٌ۔ حلقہ۔ اِنفصام۔ ٹوٹنا اور وُثقیٰ۔ مضبوط کو کہتے ہیں۔ اچھا بچو! اب آیۃ الکرسی کے متعلق کچھ ضروری باتیں سن لو اور انہیں خوب یاد رکھو۔ حدیثوں میں اس آیت کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

ایک حدیث میں حضور نے فرمایا ہے کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد اس آیت کی تلاوت کرتا رہے اس کا مرتبہ اس مومن کا جیسا ہوگا جو اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ دشمنانِ اسلام سے جہاد کر کے شہادت پائے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص اس آیت کو سوتے وقت پڑھتا ہے تو رات بھر اس کی، اس کے گھر والوں کی اور اس کے ہمسایہ والوں کی ہر بلا اور آفت سے حفاظت ہوتی ہے اور اللہ اس شخص سے ہزاروں بلاؤں اور برائیوں کو دور کر دیتا ہے۔ ایک بات یہ بھی یاد رکھو کہ آیۃ الکرسی "وَھُوَ العَلِیُّ العَظِیم" پر ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد "لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن" سے جو دوسری آیت شروع ہوتی ہے وہ آیۃ الکرسی میں داخل نہیں ہے۔

اس آیت میں اللہ کی بزرگی اور قدرت و سلطنت کو بیان

کیا گیا ہے اور یہ کہ زندگی اور موت سب اسی کے اختیار میں ہے اور آسمان و زمین کا وہی اکیلا مالک ہے۔ وہی تمام جہان کا معبود ہے اور سب کو اس کی عبادت اور اطاعت کرنا چاہیئے نہ تو اس کے انعام کو کوئی روک سکتا ہے اور نہ اس کی سزا کو کوئی بدل سکتا ہے۔ اسے ہر ہر چیز کا پورا علم ہے اس لئے انسان بھی اپنے کسی عمل کو بھی اس سے چھپا نہیں سکتا۔ اس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے مگر یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ حق اور باطل دونوں راستوں کو پوری طرح ظاہر کر دیا گیا ہے اور انسان کو اس کی سمجھ دی گئی ہے کہ وہ انہیں پہچان سکے۔ پھر اس کے بعد اگر وہ حق کو چھوڑ کر باطل اور ایمان کو چھوڑ کر کفر کو اختیار کرے گا تو سزا کا مستحق بن جائے گا۔

کیوں بچو! اب تم آیۃ الکرسی کا مطلب اور اس کی فضیلت کو اچھی طرح سمجھ گئے؟ بچے سب مل کر پکار اٹھے۔ سر! بالکل سمجھ گئے اور دیکھئے ہم نے اپنی اپنی کاپیوں پر یہ ساری باتیں نوٹ کر لی ہیں جو آپ نے بتائی ہیں۔ ✱

نوٹ:۔ اس مضمون سے سوالات بنا کر آخر میں بچوں سے انھیں پوچھا جائے۔

قرآنی تعلیمات حقیقت پسندی کی ضامن ہیں

قرآنی تعلیمات کی تمام تر بنیاد ہی حقیقت پسندی پر قائم ہے۔ اُن کا رخ نہ جہت پرستی ہے، نہ شخصیت پرستی پر۔ نہ وہ کسی خطّہ اور قوم سے خصوصی وابستگی رکھتی ہیں اور نہ کسی خاص نسل، رنگ اور زبان سے۔ اُن کا واحد اور حقیقی مقصد صرف یہی ہے کہ اولاد آدمؑ کی جس غرض کے لیے تخلیق ہوئی ہے وہ غرض پوری ہو اور انسان اُسی طرح زندگی گذارے جس طرح اُسے گذارنا چاہیئے۔ قرآنی تعلیم کا خطاب انسانی معاشرہ کے ہر فرد سے یکساں طور پر ہے۔ اس خطاب میں امیر و غریب، محکوم اور حاکم، آزاد اور غلام، شاہ و گدا سب ہی ایک صف میں نظر آتے ہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک موقع پر اپنے اصحابؓ کرام سے فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل کی تباہی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ شرعی احکام کے نافذ کرنے میں شخصیت کو پیش نظر رکھتے تھے یعنی

اگر کوئی غریب اور چھوٹا آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اسے سزا دیتے تھے لیکن اگر وہی جرم کوئی بڑا اور اثر والا آدمی کرتا تھا تو اُسے کچھ نہیں کہا جاتا تھا اس لیئے میری اُمّت کو ہمیشہ اس قسم کی تفریق سے بچنا چاہیئے۔ حضورؐ انور کی پوری حیات پاک اسی اصول کا نمونۂ کامل تھی۔ آپ نے کبھی اور کسی موقع پر بھی الٰہی احکام کے نافذ کرنے میں اس قسم کی تفریق کا شائبہ تک نہیں آنے دیا اور اپنے عمل سے اس بات کو ثابت کر دیا کہ اسلام کی تعلیمات کی بنیاد صرف حقیقت پسندی پر قائم ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی رجحان اُن میں نہیں پایا جاتا۔ قرآن میں کثیر مقامات پر اسی حقیقت پسندی کی طرف طرح طرح سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ کا ارشاد ہے: لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ الایہ" نیکی یہ نہیں ہے کہ تم عبادت کے وقت اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف کر لیا کرو اس کے بعد فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اس کے بجائے اصل نیکی تو یہ ہے کہ آدمی اللہ پہ ایمان لائے اسی طرح قیامت کے دن، فرشتوں، اللہ کی کتابوں

اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنا مال اللہ کی محبت میں قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں، پریشان حال مسافروں اور عام ضرورتمند سوال کرنے والوں کو دے اور لوگوں کی گردنیں آزاد کرنے اور انھیں چھڑانے کے لئے صرف کرے۔ نماز پابندی سے پڑھا کرے، زکواۃ باقاعدہ ادا کرے اور جب یہ لوگ کوئی عہد کریں تو اس عہد کو پورا کریں اور فقر و فاقہ میں اور تکلیف و بیماری میں صبر سے کام لیں اور جنگ کے موقع پر ثابت قدم رہیں۔ ایسے ہی لوگ سچے مومن ہیں اور یہی متقی اور پرہیزگار ہیں۔ اس آیت میں اعتقادات کی اسطرح اصلاح کی گئی ہے کہ اسلام سمت و جہت پرستی، خطہ پرستی اور اسی طرح کے دوسرے انفرادی یا اجتماعی رجحانات کی قطعی طور پر اجازت نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک انسان کے تمام اعتقادات کا واحد مرکز اللہ کی ذاتِ اقدس ہے اور وہ لامکاں ہونے کے باوجود ہر جگہ موجود ہے اس لیے اس نے انسان کو اس قسم کے غلط تخیلات اور باطل اعتقادات سے سختی کے ساتھ روک دیا اور اسے تعلیم دی کہ وہ سمت و جہت کی

طرف رخ کرنے کے بجائے کعبۂ مکرمہ کی طرف رُخ کیا کرے خواہ وہ اُس کے لیے کسی سمت میں بھی کیوں نہ پڑے جہتیں اور سمتیں ہر جگہ بدل جایا کرتی ہیں مگر کعبہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نہیں بدلتی۔ یہاں لفظ مشرق اور مغرب کے وسیع مفہوم میں ہر طرح کی مکانی اور خطّہ وارانہ تفریق شامل ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اسلام اور قرآن کی ہر تعلیم اس زہر سے پاک ہے۔ اُس کے نزدیک سمت و جہت اور مکانی حدبندیاں انسان کو اپنا تابع نہیں بنا سکتیں بلکہ وہ خود انسان کی تابع ہیں ؎

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کیلیے (اقبالؒ)

کائنات کے پورے معاشرے میں اِنسان کی برتری اور اشرفیت ایک ایسی حقیقت ہے جسے صرف اسلام نے بتایا اور ظاہر کیا ہے ورنہ انسان کو اس کی خبر ہی نہ تھی کہ خلقِ خدا میں اُس کا مقام کیا ہے۔ قرآن کریم کی اس عظیم آیت نے بنی نوع انسان کو توحید کی غیر فانی حقیقت سے روشناس کر کے اُس کو مادیت پرستی

عقلیّت

لاادریّت

اور ہزارہا "ازموں" سے نجات دلادی - اس کا صرف یہی نتیجہ یہی ہے کہ کوئی ایسا مذہب جس کی بنیاد انسان کی انفرادی یا اجتماعی فکری پیداوار پر ہو اور جس کا وحی والہام اور نبوّت و رسالت کے الٰہی نظام اور توحید کے مستحکم اور غیر متزلزل قانون سے کوئی رشتہ نہ ہو وہ قطعی طور پر انسانی مقصد پیدائش کو صرف پورا ہی نہیں کر سکتا بلکہ وہ اس کے منافی اور اس کے لئے تباہی و بربادی کا باعث ہے۔

قرآن پاک نے سمت و جہت کی نفی اور ایمان کے ہر بنیادی رُخ کی تشریح کر کے اس حقیقت پر سے پوری طرح پردہ اٹھا دیا کہ انسان محکوم، تابع ہے، مخلوق ہے، رعیت ہے، اور غلام ہے جس کا آقا صرف اللہ ہے اور جس کا مالک، حاکم، خالق اور رازق بھی صرف وہی ہے۔

ایمان کی بنیادی اور حقیقت پسندانہ تعلیم کے بعد جس کا براہ راست تعلق اللہ کی ذات و صفات سے ہے۔ اس آیت میں اعمال کے مختلف شعبوں سے متعلق کچھ حقائق

کی تعلیم دی گئی ہے - ان اعمال میں کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق انسان کے بدن سے ہے اور کچھ وہ ہیں جو اُس کے مال اور اس کی آمدنی سے متعلق ہیں - مال جمع کرنے اور اُسے خرچ کرنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں لیکن قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ مال کو صحیح اور جائز ذریعہ سے جمع کیا جائے اور صحیح و جائز مصارف میں صرف کیا جائے اور یہ جواز یا حرمت اور جائز نہ ہونا انسان خود ذاتی طور پر طے نہیں کرسکتا بلکہ اس بات کا طے کرنا اللہ ہی کی طرف سے ہوگا کیونکہ وہی ہمارا اصلی حاکم ہے - اس مال کی تقسیم میں انسانی معاشرہ کے جن طبقوں کا ذکر ہے اُس سے اس کا پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنِ حکیم نے اسلام کے جس معاشی نظام کی تعلیم دی ہے وہ کس قدر حقیقت پسندانہ ہے اور کس قدر انسان کے پیدائشی تقاضوں کے مطابق ہے !-

پھر عبادت کا ذکر کیا گیا ہے جس کے لیئے لفظ "صلوٰۃ" اور "زکوٰۃ" کہکر ہر قسم کی بدنی اور مالی عبادت کی طرف اشارہ کردیا گیا پھر اخلاقی تعلیم دی گئی ہے یہ فرماکر کہ جب تم کسی سے کوئی وعدہ کرو یا معاہدہ کرو تو اُسے پورا کرو خواہ یہ

اہدہ اللہ سے ہو یا بندوں سے ۔ مسلمان سے عہد و قرار
یا غیر مسلموں سے قرآن کریم نے اس تعلیم سے جس حقیقت
ندی کا ثبوت دیا ہے وہ دنیا کی کسی قوم کے نظامِ زندگی
ب نہیں ملتی ۔ یہ معاہدہ سیاسی ہو، تجارتی ہو، ثقافتی ہو،
نی ہو یا آپس کے حقوق کی نگہداشت اور تحفظ سے متعلق ہو
اسی طرح انسانی اقدار کی حفاظت اور انسان کے انفرادی
اور اجتماعی حقوق اور ذمّہ داریوں کا جس طرح اسلام نے
سبق دیا ہے اُس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ
میں نہیں ملتی ۔ درحقیقت قرآنی نظامِ حیات انسانی زندگی
کو ۲ دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے ۔ جن میں سے ایک حصّہ کا تعلق
حقوق اللہ سے ہے اور دوسرے کا حقوق العباد سے ہے ۔
انسانی زندگی کے ان دونوں حصّوں سے متعلق قرآن کریم
نے جو انتہائی مضبوط اور مربوط بنیادی تعلیمات بیان کی
ہیں وہ زمان و مکان کی پابندیوں اور حدبندیوں سے آگے
اور آفاقی ہیں اور قیامت تک کے لیئے ناقابل تغیر و تبدل
ہیں ۔ کیا اِس سے زیادہ حقیقت پسندی، حقوق عباد
کے سلسلہ میں ممکن ہو سکتی ہے کہ اسلام نے ہر مسلمان کو

اس کا صاف لفظوں میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کے لیئے باعث تکلیف نہ بنے۔ چاہے وہ انسان کسی قوم و ملت اور کسی خطہ زمین اور کسی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ چنانچہ حدیث نبوی کے یہ الفاظ ہیں: المسلم من سلم الناس من لسانہ و یدہ۔ سچا مسلمان تو وہی ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں یعنی ان کی زندگیاں بھی محفوظ رہیں، اُن کی آبرو اور عزت بھی محفوظ رہے اور اُن کا مال و اسباب اور اُن کی زندگی کے تمام حقوق محفوظ رہیں۔ قرآن کریم نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو عدل و انصاف کے راستہ سے کبھی ہٹنے نہ دے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا اور ہمیشہ لوگوں کو معاف کرتے رہے مکہ کی زندگی میں مشرکین قریش نے خود حضور انور اور تمام بنی ہاشم کا تین سال تک مسلسل مقاطعہ یعنی بائیکاٹ کیا اور جب چھوٹے چھوٹے بچے بھوک اور پیاس کی تکلیف سے روتے تھے تو ان بچوں کی دردناک آوازیں سن کر مشرکین مکہ مذاق اڑاتے تھے اور

ہنسا کرتے تھے لیکن سرورِ کائنات نے کبھی کسی قوم کا جائز اور صحیح حق ساقط اور برباد نہیں کیا اور نہ مسلمانوں کو ایسا کرنے کی اجازت دی ہے - اس کے بجائے اسلام اور رسولِ اسلام نے اپنی امتِ مسلمہ کی ہر طرح حفاظت کرنے کا اعلان کیا۔ یعنی اس کو پورا تحفظ دیا اور ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کی پاسبانی اور حفاظت کرے - ایک حدیث میں ہے: خصلتان لیس فوقہما شر: الشرک باللہ والاضرار لعباد اللہ - دو برائیاں ایسی ہیں جن سے بڑھ کر کوئی برائی ممکن نہیں ہوسکتی ایک شرک یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا اور دوسرے اس کے بندوں کو ضرر پہنچانا - ایک اور حدیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے: الخلق کلھم عیال اللہ واحبھم الی اللہ انفعھم لعیالہ - تمام مخلوقات اللہ کا گویا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ انسان ہے جو اس کے اس کنبہ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے - اللہ کی ذات لم یلد ولم یولد ہے مگر اس نے اپنی مخلوق کو اپنا کنبہ فرمایا ہے - اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کے نزدیک

مخلوقاتِ الٰہی کی کس قدر عزت اور پاس و لحاظ ہے۔
ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص زمین کے رہنے والوں پر رحم نہیں کرتا آسمان کا خالق یعنی اللہ اس پر رحم نہیں فرماتا۔ یہ وہ قرآنی اور اسلامی تعلیمات ہیں جو قیامت تک کے لیے حقیقت پسندی کی بھرپور ضامن ہیں۔

سرورِ کائنات بحیثیت منتظم

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ پاک کے انتظامی پہلو سے بحث کرنا ایک ایسے اہم موضوع پر روشنی ڈالنا ہے جس پر چند منٹ کی ایک مختصر تقریر یا تحریر کسی طرح بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک عظیم قوم اور عظیم مملکت کے منتظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے ہر اُس انتظامی شعبہ سے بحث کی جائے جس کا تعلق آپ کی ذاتِ گرامی سے ممکن ہو سکتا ہو لیکن اس وقت ہمیں تفصیلات میں جانا نہیں ہے بلکہ صرف اجمالی طور پر ہی حضورِ انور کی ذاتِ اقدس کے اس انتہائی اہم رُخ پر نظر ڈالنا ہے۔

یہ بات تو ہم بنیادی اور اصولی طور پر جانتے ہی ہیں کہ اسلام کی اصلی غرض دنیا میں کوئی سلطنت اور مملکت کا قائم کرنا نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ضمنی طور پر اس کا

قیام عمل میں لانا ضروری ہو جائے بلکہ اُسکی اصلی غرض نوعِ انسان کی فکری اور عملی اصلاح ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تمام اولاد آدمؑ اللہ کے مقرر کیئے ہوئے نظام کے تحت امن وسلامتی کے ساتھ انتہائی پرسکون زندگی گذارے اور سب کے سب اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری سہولت اور پورے نظم وضبط کے ساتھ انجام دیں۔ بنیادی مقصد تو صرف اس حد تک محدود ہے لیکن یہ مقصد اس وقت تک پورا ہی نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے ایک مضبوط نظام موجود نہ ہو اور وہ تمام وسائل اور ذرائع نہ ہوں جو اس نظام کو نافذ کرنے کے لیئے ضروری ہیں جس کی وجہ سے لازمی طور پر ہم ایک مملکت کے تصور تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے۔

سرورِ کائنات کی حیاتِ طیبہ کا تعلق جب تک ہجرت سے قبل صرف مکہ اور اس کے قرب وجوار ہی سے تھا آپ کی ذات پر وہ انتظامی ذمہ داری نہ تھی جو مدینہ میں آنے کے بعد شروع ہوئی اور پھر چند ہی سال میں یہ ذمہ داری ایک عظیم ترین مصلح کی حیثیت کے ساتھ ساتھ ایک عظیم

مملکت کے سربراہ اور سب سے بڑے منتظم کی ذمہ داری کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ ایک عظیم مصلح کی حیثیت سے آپ کو اصلاحِ کردار اور دینی تربیت کے جس قدر بھی شعبے ہوسکتے ہیں ان سب کا انتظام کرنا تھا اور اس انتظام کو ہر چیز پر اوّلیت حاصل تھی کیونکہ یہی اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔ اس شعبہ میں دینی تعلیم کے مرکزوں کا انتظام، مقدمات کے فیصلے، میراث کی تقسیم، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگرانی، تعزیرات کے قوانین کا تعین اور اُن کا نفاذ، مساجد کا انتظام، تبلیغ دین کے لیے جابجا مناسب اور موزوں لوگوں کا تقرر، اور اسی طرح کے دوسرے امور داخل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری اُن تمام انتظامی امور سے تھی جن کا تعلق ملکی معاملات سے ہوا کرتا ہے۔ اس شعبہ میں امن و امان کا قائم رکھنا، ملک کی معیشت اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا، ناگہانی آفتوں کے لیے بچاؤ کا بروقت مکمل بندوبست رکھنا، قوم کو معاشی، تجارتی، صنعت و حرفت، زراعت، وسائل نقل و حمل اور عام فنی اور دیگر ضروری علوم کی تحصیل میں ترقی کے مواقع

مہیا کرنا اور ایسے طریقے اختیار کرنا جن سے مملکت کے لوگوں کو دینی امور کے ساتھ ساتھ دنیوی امور میں بھی خوشحالی اور ترقی کا حق حاصل ہو سکے اور ساتھ ہی بیرونی حملوں اور خطروں سے بچاؤ کا سامان کرنا، مملکت کو خود کفیل بنانا اور اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے راستے بنانا اور اُن راستوں پر چلانا۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جبکہ قوم بدترین قسم کے افلاس اور اقتصادی تباہی میں مبتلا ہو اور اس میں اندرونی اور بیرونی کسی قسم کی بھی کوئی تنظیم موجود نہ ہو اور اس کا ایک ایک فرد پڑوسی قوموں کی استحصالی گرفت میں سسک رہا ہو، اُس کی بدنظمی کو دور کرنا، اس کے جذبۂ حرّیت و خودداری کو اجاگر کرنا اور اس میں خودی اور خودشناسی کی روح پھونک دینا ہر ایک انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

سرورؐ کائنات کی بعثت کے وقت سے ہجرت تک اور پھر ہجرت کے بعد غزوۂ خیبر تک مسلمان جس کشمکش کی زندگی گذار رہے تھے وہ سب ہی جانتے ہیں ایسے مایوس کن حالات میں جبکہ مسلمانوں کے لیئے ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ تباہی و بربادی، مایوسی، قید و بند، قتل و غارت، آوارہ

وطنی اور طرح طرح کے خطروں سے بھرا ہوا تھا، مشرکین قریش اور یہود اپنی دولت، اپنے اسلحہ اور اپنی افرادی طاقت کے ساتھ اور اپنے سازوسامان کی فراوانی کے ساتھ ان بے سہارا، غیر منظّم، غیر مسلّح اور اقتصادی پریشانی سے نڈھال حق پرستوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا لینے پر تُلے ہوئے تھے اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ان کے ذہن حرّیت انسان کے تصور سے بھی آشنا نہ تھے اور یہی سمجھتے تھے کہ وہ مشرک سرداروں اور یہود مہاجنوں اور ساہوکاروں کی غلامی ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی غلامی میں انھیں جینا ہے اور اسی میں انھیں مرنا ہے۔

ایسے انتہائی خطرناک ماحول میں مایوسی اور بےبسی کے گہرے احساس کو خود داری اور عزتِ نفس کی بلندیوں میں بدل دینا اور ایک بے سہارا اور غلامی کی خوگر قوم کو، ایک انتہائی وحشی اور جاہل و گمراہ گروہ کو، ایک خون آشام، درندہ صفت، مغرور، بے رحم اور غیر منظّم جماعت کو نظم و ضبط سے آگاہ کرنا، اخوت و رحمدلی سے روشناس کرنا، مایوسی کے احساس کو عزمِ راسخ اور

خود اعتمادی میں تبدیل کرنا اور آپس میں اتحاد اور باہمی نظم وضبط کو اتنا مستحکم بنا دینا کہ گنتی کے چند نہتے مسلمان میدانِ بدر میں ایک ہی حملہ میں دشمن فوج کی آہنی چٹانوں کو پاش پاش کر دیں یہ وہ تاریخی حقیقتیں ہیں جو سرورِ کائنات کی ذاتِ اقدس کو ایک ایسے عظیم منتظم کی حیثیت سے نسل انسانی کے سامنے لاتی ہیں جس کی مثال قیامت تک ممکن نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسا منتظم جس نے نو سال کے قلیل عرصہ میں اپنے دشمنوں سے تقریباً نوّے لڑائیاں لڑیں۔ بعض جنگوں میں حضورؐ تو خود میدانِ جنگ میں محاذ پر تشریف لے گئے اور باقی جنگوں میں اصحابِ کرامؓ کو بھیجا مگر اسقدر لڑائیوں کے باوجود نہ تو کبھی جنگی انتظامات میں فرق آیا اور نہ کبھی شہری نظم میں ابتری پیدا ہوئی، نہ کبھی مسلمانوں کی صفوں میں انتشار آسکا اور نہ اُن کے حوصلہ کی بلندی میں کوئی کمی آنے پائی اور اسی حسنِ انتظام اور خوبیٔ تدبیر کا نتیجہ تھا کہ چند ہی روز میں وہ قوم جو دوسروں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی قیامت تک کیلئے خود اعتمادی، خودداری، عزم و جرأت اور حریتِ انسان کا روشن نشان بنکر ابھر آئی۔

رسولِ کریمؐ بحیثیتِ مقنّن

اس وقت کی تقریر کا تعلق جس موضوع سے ہے اس کے لئے مجھے سب سے پیشتر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اس قانون کے نافذ کرنے والے تھے جسے خود اللہ نے بنایا تھا اس بنا پر قانونِ اسلام کا اصلی مُقنّن تو اللہ ہی ہے البتّہ حضورؐ اس قانونِ خداوندی کے نافذ کرنے والے یعنی اس پر عمل کرانے والے ہیں جبکہ یہ ایک ایسا مکمّل قانون ہے جس میں اب قیامت تک کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ تو اب اس صورتِ حال کی بنا پر ہمیں صرف اسی چیز پر غور کرنا ہوگا کہ یہ مجموعۂ قوانین جس کا نام اسلام ہے، انسانی زندگی کے لیے کس قدر جامعیت اور کتنی اہمیت کا حامل ہے اور آنحضرتؐ نے اُسے نافذ کرنے میں کس عظیم تدبر سے کام لیا جو آئین اور قانون کی تاریخ میں اپنی آپ ہی مثال ہے۔ جہاں تک اگلے پیغمبروں کی تاریخ ہمارے سامنے

موجود ہے، ہمیں اکثریت اُن ہی انبیاءؑ کی ملتی ہے جن کا تعلق سلطنتی نظام سے بحیثیت سربراہ کے نہ تھا۔ قرآن حکیم میں حضرت داؤدؑ اور طالوتؑ کے ذکر میں اس حقیقت کی طرف وضاحت کے ساتھ اشارہ پایا جاتا ہے۔ صرف چند پیغمبر ایسے گزرے ہیں جو اپنی روحانی دعوت حق کے ساتھ ملکی اور سلطنتی نظم وضبط کے بھی سربراہ تھے۔ ایسی ہستیوں میں حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہم السلام نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں کسی وقت بھی اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ ان پیغمبروںؑ کی حکومت وسلطنت بھی صرف اُن ہی اصول اور بنیادوں پر قائم تھی جو اللہ کی مقرر اور معیّن کی ہوئی تھیں اور یہ لوگ محض انھیں نفاذ دینے والے تھے۔ بلاشبہ سرورِ کائنات کی عظیم ترین شخصیت ایسے مرسلین میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضور پُرنور نے آخری نمائندۂ الٰہی کی حیثیت سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی فلاح وبہبود کے لیے ایسے قانون کو نافذ کیا جس کے ایک حصّہ کا تعلق انسانی

کردار کی تطہیر اور پاکیزگی سے ہے اور دوسرے حصّہ کا تعلق اُس کی مادّی زندگی کے نظم وضبط سے ہے۔ اس دوسرے حصّہ میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جن کا فرد اور معاشرہ دونوں ہی کے حقوق اور ذمہ داریوں سے تعلق ہوتا ہے اور یہی وہ حصّہ ہے جس سے سلطنتی اور حکومتی نظام کی صورت ابھرتی ہے۔ سرورِ کائنات کی ذاتِ گرامی نے دنیا میں ایک ایسے قانون کو نافذ کیا ہے جس کے دائرۂ عمل میں کوئی ایک مخصوص خطّۂ زمین یا کوئی خاص قوم نہ تھی بلکہ اس کا اطلاق پوری نسلِ آدم پر ہوتا ہے اور ہر دور اور ہر زمانہ کے آنے والوں پر خواہ وہ کوئی زبان بولتے ہوں، کسی قوم و قبیلہ کے ہوں، کسی رنگ اور کسی خطّۂ زمین سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس سطحِ زمین پر بسنے والی قومیں جب کسی قانون کی تشکیل کرتی ہیں تو اس میں ان کے مخصوص مفاد اور انفرادی تاثر اور اُن کے محدود ماحول کے تقاضوں کا شامل ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ انسانی عام سطح پر یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ہی قوم یا ایک ہی فرد کوئی ایسا قانون بنا سکے جو دنیا بھر کی تمام قوموں اور سارے ہی

انسانی افراد کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور ہر ماحول پر
پوری طرح منطبق ہو سکے۔ آئین کی تشکیل اور قانون
بنانے کے کام میں فرد، جماعت اور ملک، قوم اور خطہ یا
ماحول کے سیاسی اور غیر سیاسی مخصوص تاثرات کا شامل
ہو جانا لازمی ہوتا ہے۔ اسلیئے کوئی ایسا قانون جس
میں ذاتی یا جماعتی مفادات کا کوئی لگاؤ نہ ہو اور جس
میں کسی خصوصی ماحول کا کوئی تاثر نہ موجود ہو اور جو ہر
فرد، ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیئے بھرپور یکسانیت کا حامل
ہو وہی بنا سکتا ہے جو ذاتی، قومی، مذہبی، سیاسی،
ملکی، نسلی اور جنسی رجحانات سے پاک و منزّہ ہو اور
اس کی نظر میں پورا انسانی معاشرہ فردِ واحد کی
حیثیت رکھتا ہو اور وہ سوائے خالقِ کائنات کی عظیم
تر ین ذات کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا پھر اس کے
ساتھ ہی ایسے ہمہ گیر قانون کا نفاذ بھی کوئی معمولی کام
نہیں ہے جو کسی عام سطح کے انسان کے لیئے ممکن ہو سکے۔
بلکہ اس کا نافذ کرنے والا بھی وہی ہو سکتا ہے جو قیامت
تک آنے والی ہر نسلِ انسانی کے سیاسی اور سماجی اور انکی

زندگی کے ہر رجحان اور ہر تقاضے کو پوری طرح جانتا ہو
اور آئینی و قانونی نقطۂ نظر سے اس کی نگاہ میں تمام انسان
برابر ہوں اور اس نفاذ قانون کے کام میں اس کے کسی
بھی انفرادی رجحان اور کسی قسم کے مخصوص مفاد کو دخل نہ
ہو۔ اللہ جلّ شانہٗ کی ذات اقدس کے بعد حضور انورؐ ہی
کی عظیم ترین ہستی ہے جس نے نسل بشری کے لیے اس ہمہ گیر
قانون کو نافذ کیا جسکا نام اسلام ہے۔ جس کا بنانے والا
اللہ ہے اور جس کے مرشد و معلّم اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جنہوں نے حجۃ الوداع کے موقع
پر ایک یادگار تاریخی اجتماع میں اپنی مبارک زندگی کے
آخری دور میں اس لازوال آئینی حقیقت کا اعلان فرمادیا
تھا کہ اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ عزت صرف اسی
انسان کی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو یعنی سب سے زیادہ
اس کے قانون عدل کی پیروی کرنے والا ہو۔

صادقؑ و امین

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سچّائی اور امانتداری کا سکّہ آپ کے دشمنوں کے دلوں پر بھی جما ہوا تھا اور آپ پورے عرب میں صادق و امین کے لقب کے ساتھ مشہور تھے۔ اعلانِ رسالت کے بعد بھی آپ کے بدترین دشمنوں کو کبھی اس کی جرأت نہ ہوسکی کہ آپ کی سچائی اور امانت سے انکار کرسکیں۔

سچّائی ایک ایسی صفت ہے جس کے بغیر کبھی کسی شخص کے قول و فعل پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا پھر سچائی سے مراد صرف زبان ہی کی سچائی نہیں ہے بلکہ اس کے مفہوم میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی سچائی مراد ہے۔ نیت اور ارادہ کی سچائی، قول کی سچائی اور عمل کی سچّائی اپنی تمام قسموں اور تمام شکلوں اور صورتوں کے ساتھ اس کے اندر شامل ہیں۔ صدق اور سچّائی

وہ جلیل صفت ہے جیسے قرآنِ کریم میں بار بار اللہ کی صفتوں میں خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور طرح طرح سے اللہ نے صادقین کی تعریف کی ہے۔ سورۃ مائدہ میں ہے کہ قیامت کے روز جو چیز کام آنے والی ہے وہ صدق کی صفت ہے۔

سورۃ توبہ میں فرمایا گیا ہے۔ کہ اے ایمان والو! تم پرہیزگاری اختیار کرو اور ہمیشہ سچوں کی پیروی کرتے رہو۔ غرض جب سچائی اور صدق کی صفت ہر انسان کے لیے ضروری ہے تو ظاہر ہے کہ پیغمبروں اور پھر حضرت خاتم المرسلین کی ذاتِ اقدس میں یہ صفت کس حد پہ ہوگی آپ کی سچائی اور امانت ہی کی وجہ سے آپ کے پاس لوگ اپنی امانتیں رکھوایا کرتے تھے چنانچہ جب آپ مکہ سے ہجرت کے ارادہ سے مدینہ جانے لگے تو حضرت علیؓ کو خصوصی طور پر ہدایت فرمائی کہ جن لوگوں کی میرے پاس امانتیں رکھی ہوئی ہیں تم ان تمام امانتوں کو ادا کرنا۔ ان امانتوں میں اُن کی امانتیں بھی تھیں جو مسلمان نہ تھے مگر انھیں یقین تھا کہ آنحضرتؐ کبھی کوئی غلط بات نہیں

کہہ سکتے، کبھی سچائی کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے اور کبھی امانت میں ذرّہ برابر بھی خیانت نہیں کر سکتے۔ اسی سچی زندگی اور ایمانداری کی طرف سورۂ یونس میں اس طرح ارشاد کیا گیا ہے کہ اے رسولؐ تم ان کافروں سے کہدو کہ اعلانِ نبوت سے قبل میں تمہارے درمیان کافی لمبی مدّت تک رہا ہوں اور تم میری زندگی، میری سچائی اور میری ایمانداری سے اچھی طرح واقف ہو پھر آج بھی میری زندگی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی اور اب میری باتوں میں کوئی ایسی چیز کیسے پیدا ہو سکتی ہے جو میری امانت اور سچائی کے خلاف ہو۔

حضورؐ انور کی سچائی اور امانت ہی تھی جس کی وجہ سے حضرت ام المؤمنین خدیجہؓ نے اپنی تجارت کے تمام کاموں کی ذمّہ داری آپ ہی کو سونپ دی تھی اور اسی سچائی، امانت اور اخلاقِ حسنہ کا نتیجہ تھا کہ حضرت خدیجہؓ نے آپ کے ساتھ نکاح کیا اور آپ کو بحیثیت شوہر کے فخر کے ساتھ قبول کیا۔ سرورؐ انبیاء کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس میں آپ نے اپنے بدترین

دشمنوں کے ساتھ بھی کبھی عہد و قرار کی خلاف ورزی کی ہو اور سچائی اور امانت کے خلاف اپنے عمل میں ذرا سا بھی کوئی شائبہ پیدا ہونے دیا ہو۔

صدق و امانت کا مفہوم جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا انسانی زندگی کے کسی مخصوص رخ میں منحصر اور محدود نہیں ہے بلکہ وہ انسانیت کی پوری زندگی پر محیط ہے۔

اور اسی طرح صدق و امانت خدا اور اس کے بندوں دونوں ہی سے متعلق ہے یعنی مسلمان کیلئے جس طرح اللہ کے بندوں کے ساتھ سچّائی اور امانت کا برتاؤ زندگی کے ہر شعبہ میں کرنا ضروری ہے اسی طرح اپنے پروردگار کے سامنے بھی اُسے صدق و امانت کا ہر شعبۂ حیات میں ثبوت دینا لازمی ہے۔ کیونکہ مسلمان کی ذمّہ داری ادائے حقوق کے سلسلہ میں صرف انسانوں اور مخلوقات کے سامنے ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری اللہ کے سامنے بھی بڑی شدت کے ساتھ ہوتی ہے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جس شخص میں امانت نہیں ہوتی اس میں ایمان ہی نہیں ہے اور جس کو اپنے عہد

کی سچائی کا پاس و لحاظ نہ رہے گا اس کا دین درست نہ ہوگا اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی دولت حاصل کرے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس شخص کو ہرگز اُس میں برکت نہیں دی جائے گی اور اگر اس میں سے کچھ خیرات کرے گا تو وہ کبھی قبول نہ کی جائے گی۔ پھر جو مال اُس ناجائز دولت سے بچ رہے گا وہ اس کے جہنم کی طرف سفر کا توشہ ہوگا۔ بُری چیز بُری چیز کا کفّارہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں اچھّی چیز اچھی چیز کا کفارہ بن سکتی ہے۔

کنز العُمّال میں روایت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت اس وقت تک اپنی فطری اور پیدائشی صلاحیت پر باقی رہے گی جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی۔

غرض امانت اور سچائی وہ صفت ہے جو انسان کو حقیقی معنی میں انسان بنا دیتی ہے۔ اور یہ صفتیں آنحضرتؐ میں بدرجۂ کمال موجود تھیں۔

کفّار و مشرکین نے کبھی آپ کو دروغ گو اور خیانت کا مرتکب کہنے کی جسارت نہیں کی بلکہ صرف یہ کہتے تھے کہ العیاذ باللہ

یہ شاعر ہیں یا مجنون ہیں۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ایک روز مکہ میں قریش کے بڑے بڑے رئیس اور سردار کسی جگہ جمع تھے اور طرح طرح کی گفتگو ہو رہی تھی اسی سلسلہ میں آنحضرتؐ کا ذکر بھی چھڑ گیا اس وقت نضر بن حارث ایک مشہور سردار نے کہا کہ محمدؐ نے جس دین کا اعلان کیا ہے وہ تمہارے لیئے ایک بڑی مصیبت آئی ہے لیکن اب تک تم اس مصیبت کو دفع نہ کر سکے۔

اور جہاں تک خود محمدؐ کا تعلق ہے تو وہ تمہارے درمیان بچہ تھے پھر تمہارے سامنے ہی جوان بھی ہوئے اور ہمیشہ تم میں سب سے زیادہ صادق القول اور امین بھی رہے۔ اور امانت اور سچائی کے خلاف تم نے کبھی اُن میں کوئی بات نہیں پائی اور اب جب اُن کے بالوں میں سپیدی آگئی ہے اور تمہارے سامنے اُنھوں نے دین اسلام کو پیش کیا ہے تو تم کہتے ہو کہ وہ ساحر اور کاھن ہیں اور شاعر و مجنون ہیں۔ اللہ کی قسم میں نے اُن کی تمام باتیں سنی ہیں۔ محمدؐ میں ان عیبوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے جنہیں تم بتاتے ہو۔

قیصر روم نے اپنے بھرے دربار میں ابوسفیان سے پوچھا تھا کہ محمدؐ کو تم لوگوں نے اُن کے دعوائے نبوت سے کبھی اور کسی موقع پر بھی دروغ گوئی کرتے ہوئے پایا تھا۔ تو ابوسفیان نے جواب دیا تھا کہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ اسوقت تک ابوسفیان مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ آنحضرتؐ کے بدترین دشمنوں میں سے تھے۔ قیصر نے کہا کہ پھر جو شخص انسانوں کی خیانت نہ کرتا ہو اور اُن سے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو وہ اللہ پر کیسے افترا باندھ سکتا ہے اور کس طرح اس کے بارے میں امانت کی خلاف ورزی کر سکتا ہے۔

جمعۃ الوَداع

عام ھدایات

(۱) بورڈ پر لکھا جائے :۔ جمعۃ الوَداع (واؤ پر زبر کے ساتھ) یعنی ماہ رمضان کا آخری جمعہ۔ (۲) جمعہ کا دن ہر دن سے افضل ہے اور ماہ رمضان کا جمعہ سال بھر کے دوسرے مہینوں کے جمعوں سے افضل ہے۔ جمعۃ الوَداع خود ماہ رمضان کے جمعوں سے افضل ہے۔ (۳) جمعہ کی نماز ہر مسلمان کو پڑھنا چاہیئے سوائے نابالغ اور مسافر اور غلام اور بیمار اور عورتوں کے کہ ان سے ساقط ہے۔ (۴) جمعہ کے دن نماز جمعہ سے قبل غسل کرنا اور صاف پاک کپڑے پہننا ضروری ہے۔ (۵) جمعہ مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہے اور جمعۃ الوَداع ماہِ رمضان میں سب سے بڑی ہفتہ وار عید ہے۔

فیچر میں جن ناموں کا ذکر آتا ہے :۔ بابا (نعیم، شہلا اور سہیل کے والد) نعیم، شہلا، سہیل۔ ماسٹر (کبیرالدین) ایک لڑکا۔ لڑکے۔ اشرف

موذّن ۔ خطیب (امام صاحب)

شہلا: سہیل! یہاں آؤ!

سہیل: جی! کہیئے آپا کیا کام ہے؟

شہلا: آج صبح سویرے سے تم اپنے دوستوں کے ساتھ چلدیئے تھے۔ اب آئے ہو! دس بج چکے ہیں۔ کہاں تھے آپ؟ میں جانتی ہوں کہ آج چھٹی ہے نہ! تم یقیناً گیند بلاّ کھیلنے گئے ہوگے! جب ہی تو تمہارا منہ تمتما رہا ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہیں پسینہ سے قمیض بھیگی ہوئی ہے!

سہیل: آپا! اور کسی دن تو کھیلنے کو ملتا نہیں تو کیا چھٹی میں بھی نہ کھیلیں؟۔

شہلا: میں کب کہتی ہوں! ضرور جاؤ! ضرور کھیلو! مگر تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ آج دن کون سا ہے؟ دیکھو نعیم بھائی جان اور پاپا صبح سویرے سے نہا دھو کر تیاری کر رہے ہیں۔

سہیل: ہاں ہاں آپا! مجھے سب معلوم ہے۔ آپ سمجھتی ہیں کہ میرا حافظہ کمزور ہے! ابھی کل ہی تو ماسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ آج ہم سب کو تیار ہوکر اور نہا دھو کر، اچھے اور صاف پاک کپڑے پہن کر ان کے پاس جامع مسجد میں جمع ہو جانا چاہیئے تاکہ ہم سب جمعۃ الوداع

کی نماز میں شریک ہو سکیں۔

شہلا: اسی لئے تو میں نے تم سے پوچھا کہ آج کون سا دن ہے۔ اچھا سہیل! یہ تو بتاؤ کہ کل تمہیں ماسٹر صاحب نے کیا کیا بتایا تھا جمعۃ الوداع کے متعلق؟

سہیل: آپا! کل ہمارے ماسٹر صاحب نے تو ایک بڑا سا لیکچر دیا تھا اور بہت سی باتیں بتائی تھیں۔

شہلا: آخر مجھے بھی تو بتاؤ۔ یہ بھی تو دیکھوں کہ تمہیں وہ باتیں یاد بھی ہیں!

سہیل: آپا! انہوں نے کہا تھا کہ دیکھو بچو! کل رمضان کا آخری جمعہ ہے۔ اس جمعہ کو جمعۃ الوداع کہتے ہیں۔ پھر وہ کہنے لگے: یوں تو ہر جمعہ کے دن بڑی فضیلت ہے اور ہر بالغ مسلمان مرد کو جو بیمار نہ ہو، کسی کا غلام نہ ہو، مسافر نہ ہو اور آپا! وہ نابالغ یعنی بچہ بھی نہ ہو یا کسی طرح سے معذور بھی نہ ہو چاہیئے کہ جمعہ کی نماز پڑھے مگر آپا! ماسٹر صاحب کہتے تھے کہ جمعۃ الوداع کی نماز پڑھنے کے ثواب کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے (ذرا آواز کھینچ کر تعجب کے لہجہ میں) اچھا میری آپا! اب آپ جلدی سے میرے کپڑے نکال دیجئے۔ میں جمعہ کا غسل کئے لیتا ہوں۔ نعیم بھائی جان بس آتے ہی ہوں گے اور

پاپا بھی اگر مجھے تیار نہ دیکھیں گے تو بس آپ تو جانتی ہی ہیں کہ ان کو کتنی جلدی غصہ آجاتا ہے۔ غضب ہی ہو جائے گا! میری تو زبردست پٹائی ہو جائے گی!

شہلا: اچھا سہیل۔ میں ابھی کپڑے لاتی ہوں جب تک نہا دھو لو!

سہیل: دیکھئے ٹوپی بھی لائیے گا۔ ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ نماز میں ننگے سر نہ جانا۔ (نعیم آگئے) سہیل صاحب کدھر ہیں شہلا!

سہیل: (فوراً چیخ کر کہا) جی! بھائی جان! میں تو بالکل تیار ہوں بس کپڑے بدل رہا ہوں۔ ابھی آیا! ابھی آیا!

نعیم: پاپا تمہارا انتظار کر رہے ہیں جلدی کرو! جلدی آؤ!

(پاپا بھی آگئے) نعیم سہیل کدھر ہے۔ ابھی تک تیار نہیں ہوا بڑا سست ہے۔ ہمیشہ ہر کام میں تاخیر کرتا ہے۔

شہلا: پاپا! وہ بس منٹ بھر میں آرہا ہے۔ کپڑے بدل رہا ہے۔ اچھا کہو جلدی کرے۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ جمعۃ الوداع میں یوں بھی مجمع بے حد ہوتا ہے اور پھر دیر کرنے سے جگہ کا ملنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ دوسرے وہاں سہیل کے ماسٹر بھی انتظار کر رہے ہوں گے۔

سہیل: پاپا! لیجئے میں آگیا۔ اب جلدی چلئے۔ واقعی ماسٹر صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔

پاپا: آؤ نعیم، سہیل چلو۔ (جامع مسجد کے قریب جاکر)

سہیل: بھائی جان! یہاں تو ابھی سے بڑا مجمع ہو گیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ابھی تھوڑے ہی لوگ ہوں گے۔

نعیم: جمعۃ الوداع میں آنے والے بہت پہلے سے آکر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں اسی لئے تو میں کہتا تھا کہ جلدی کرو! جلدی کرو! مگر تمہارا نہانا ہی ختم نہیں ہوتا تھا۔

سہیل: بھائی جان! یہ تو بتایئے کہ جمعۃ الوداع میں اس قدر مجمع کیوں ہوتا ہے ہر جمعہ کی نماز میں تو اس قدر لوگ نہیں آتے۔

نعیم: سہیل! بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ سال بھر میں بس جمعۃ الوداع ہی کی نماز پڑھتے ہیں اس لئے اس میں مجمع زیادہ ہوتا ہے۔

سہیل: یہ کیوں بھائی جان؟ انھیں تو ہر جمعہ میں آنا چاہیئے! یہ تو بڑی بد قسمتی کی بات ہے!

نعیم: ہاں سہیل میاں! تم ٹھیک کہتے ہو مگر لوگ اس بد قسمتی کو نہ سمجھیں تو پھر ان کا علاج ہی کیا ہے۔

سہیل: بھائی جان! ہمارے ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ رمضان کے ایک عام جمعہ میں نماز پڑھنے کا ثواب دوسرے مہینوں میں ستر

جمعوں میں نماز پڑھنے کے برابر ہے یعنی رمضان کے ایک عام جمعہ کا ثواب دوسرے مہینوں کے ستر جمعوں کے ثواب کے برابر ہوتا ہے اور پھر جمعۃ الوداع کی نماز کے ثواب کی تو حد ہی نہیں ہے۔

نعیم: تمہارے ماسٹر صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ تو حدیث میں آیا ہے!

سہیل: بھائی جان جلدی چلئے دیکھئے جامع مسجد تو بالکل پاس آگئی ہے اور سارے لوگ تیز تیز چلے جا رہے ہیں! دیکھیں کہاں جگہ ملتی ہے! اور ماسٹر صاحب کو بھی تو ڈھونڈنا ہے۔ مجھے تو ان ہی کے ساتھ نماز پڑھنا ہوگی میرے سب ساتھی بھی وہیں ان کے پاس جمع ہو رہے ہوں گے۔

(سہیل، بھائی جان اور پاپا مسجد میں آگئے اور ماسٹر کبیر الدین سے مل گئے)

ماسٹر صاحب: ارے بھئی سہیل تم کہاں رہ گئے تھے۔ بڑی دیر کر دی تمہارے سب ساتھی یہ دیکھو۔ جمع ہو چکے ہیں۔

سہیل: (بہت چپکے سے کہ پاپا نہ سن لیں) ماسٹر صاحب! میں اپنے پاپا اور بھائی جان کے ساتھ آ رہا تھا اس لئے دیر ہو گئی۔

ماسٹر صاحب! خیر کوئی بات نہیں۔ اچھا آؤ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک صف میں بیٹھ جاؤ۔ سہیل! اب تم میرے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہی

رہنا۔ اور دیکھو لڑکو! تم سب کے سب ایک جگہ رہنا۔ ایک دوسرے سے الگ نہ ہونے پائے اور کوئی اِدھر اُدھر غائب نہ ہو ورنہ اگر کوئی بھی اس مجمع میں غائب ہوگیا تو میں کہاں اس کو ڈھونڈتا پھروں گا۔

ساتھی: آؤ سہیل آؤ! ادھر بیٹھ جاؤ!

ماسٹر صاحب: دیکھو بچو! کل میں نے تمہیں کچھ باتیں سمجھائی تھیں وہ تمہیں یاد ہیں؟۔

بچے: جی ہاں سر! سب یاد ہیں۔

ماسٹر صاحب: ہاں! تو میں نے تم سے کیا کیا کہا تھا؟

بچے! آپ نے سر! یہ کہا تھا کہ جمعۃ الوداع کی نماز میں غسل کرکے اچھے صاف پاک کپڑے پہن کر آنا، ٹوپی پہن کر آنا، سب کے سب ساتھ رہنا، ایک ہی صف میں کھڑے ہونا، جب جمعہ کی نماز ہو تو سب خاموشی کے ساتھ اسے سنتے رہنا، جب جمعہ پڑھانے والے امام صاحب خطبہ دیں تو بڑے غور سے سننا۔ وہ کچھ اردو میں بھی وعظ کریں گے پھر عربی کا خطبہ پڑھیں گے، تم بالکل خاموشی کے ساتھ سنتے رہنا۔

ایک لڑکا: سر! آپ نے کہا تھا کہ امام صاحب عربی اور اردو کا خطبہ پڑھیں گے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کیا ایک خطبہ اردو کا ہوگا اور دوسرا عربی میں ہوگا؟

ماسٹر صاحب: نہیں نہیں! مطلب یہ ہے کہ امام صاحب پہلے کچھ اردو زبان میں وعظ کریں گے یعنی تقریر کریں گے پھر کھڑے ہو کر عربی کے دو خطبے پڑھیں گے۔ اس طرح کہ ایک عصا ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوں گے پھر عربی کا ایک خطبہ پڑھیں گے جس میں حمد و نعت کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں وعظ و نصیحت کے جملے ہوں گے اور کچھ قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کریں گے۔ اس ایک خطبہ کے بعد کچھ دیر منبر ہی پر بیٹھ جائیں گے اور چند منٹ کے بعد پھر کھڑے ہو کر اسی طرح جیسے پہلے انھوں نے خطبہ پڑھا تھا نا! ایک دوسرا خطبہ عربی میں پڑھیں گے۔ اُسی طرح حمد و ثنائے الٰہی اور نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مختصر تلاوت کلام پاک کریں گے۔

لڑکے: سر! امام صاحب یہ بڑا سا عصا کیوں ہاتھ میں لیتے ہیں؟ کیا لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے؟ خیر ہمیں تو کوئی ڈر نہیں ہے۔ ہم سے تو امام صاحب بہت فاصلے پر ہوں گے۔

ماسٹر صاحب: احمق! یہ عصا لوگوں کو دھمکانے کے لئے نہیں ہوتا ہے۔ یہ سنت ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرح کھڑے ہو کر اور اپنا دستِ مبارک عصا پر یا کمان پر رکھ کر جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے اور اسی طرح دو خطبوں کے درمیان چند لمحے بیٹھ جایا کرتے تھے اور آہستہ

آہستہ ذکرِ الٰہی فرماتے تھے۔

لڑکے: اچھا یہ بات ہے! ماسٹر صاحب ہم لوگ بالکل سمجھ گئے۔ تو اب امام صاحب اسی طرح دو خطبے دیں گے اور پہلے اردو میں کچھ تقریر کریں گے۔

اشرف! ماسٹر صاحب! میں نے تو آج تک نماز جمعہ پڑھی ہی نہیں۔ سر! یہ کتنے رکعت کی ہوتی ہے؟

ماسٹر صاحب! اشرف! تم نے بڑا اچھا سوال کیا۔ شاباش! میاں یہ دو رکعت نماز ہوتی ہے اور پہلی رکعت میں سورۂ حمد کے بعد سورۂ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ حمد کے بعد سورۂ منافقون پڑھا جاتا ہے۔ حدیث میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون ہی کی زیادہ تاکید آئی ہے، مگر پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ کے بجائے سورۂ "اعلیٰ" اور دوسری رکعت میں سورۂ الغاشیۃ پڑھنے کی روایت بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے منقول ہے۔ ایک تیسری صورت یہ بھی حدیث میں آئی ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ الغاشیۃ کو پڑھا جائے۔

ایک لڑکا: سر! یہ خطبے عید کی نماز میں بھی پڑھے جاتے ہیں؟

ماسٹر صاحب: ہاں میاں! ہاں! اس میں بھی اسی طرح پڑھے

جاتے ہیں مگر یہ خطبے یعنی جمعہ والے واجب ہیں اور عید و بقر عید کے خطبے سنت ہیں اور ایک دوسرا فرق یہ ہے کہ جمعہ کے خطبے نماز سے پہلے پڑھے جاتے ہیں اور عید کے خطبے نماز کے بعد۔

ایک لڑکا: سر! یہ بتائیے کہ نماز جمعہ کا وقت کب ہو جاتا ہے؟۔

ایک دوسرا لڑکا: سر! میں بتائے دیتا ہوں۔ بتاؤ! سر! جس وقت سورج کے زوال کا وقت ہوتا ہے نا! بس اسی وقت نماز جمعہ کا وقت بھی آجاتا ہے جیسے ظہر کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ شاباش! ٹھیک ہے۔

اشرف: سر! ایک بات تو مجھے اور بتا دیجئے۔ ابھی تو تھوڑی سی دیر ہے اذان ہونے میں۔

ماسٹر صاحب: پوچھو نا! جلدی کرو!۔

اشرف: قرآن میں بھی کہیں ذکر آتا ہے سر! نماز جمعہ کا؟۔

ماسٹر صاحب: ہاں ہاں کیوں نہیں! خود سورۂ جمعہ ہی میں تو ذکر ہے نماز جمعہ کا۔ اللہ کا ارشاد ہے۔ دیکھو میں وہ آیت پڑھتا ہوں پھر اس کا ترجمہ بھی تمہیں سکھا دوں گا۔ ہاں سر بتائیے: ماسٹر صاحب نے چپکے چپکے آیت سنائی: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اے ایمان

والو جب جمعہ کے دن اذان کہی جائے نماز جمعہ کے لئے تو چل پڑا کرو اللہ کی یاد کی طرف (یعنی نماز جمعہ کی طرف) اور خرید و فروخت چھوڑ دیا کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔"

اشرف: سر! واقعی یہ تو بالکل صاف حکم ہے جمعہ کی نماز کا تو یقیناً ہم سب کو جمعہ پڑھنا چاہیئے۔ اور پھر سر! جُمعَۃ الوَداع میں تو شریک ہونا بہت ہی ضروری ہو گا۔ سر! یہ بھی بتا دیجئے کہ جُمعَۃ الوداع کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کو تو حضورؐ بڑی خاص اہمیت کے ساتھ پڑھاتے ہوں گے!

ماسٹر صاحب: ہاں بچو! یہ بات یاد رکھو کہ جُمعَۃ الوَداع کے دن کو حضورؐ بڑی اہمیت دیا کرتے تھے۔ مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کا نام تو تم لوگوں نے سنا ہی ہو گا۔ ہاں سر! وہ تو بہت مشہور صحابی تھے۔ ہاں تو وہ بیان کرتے تھے کہ میں رمضان کے آخری جمعہ میں یعنی جُمعَۃ الوَداع کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب حضورؐ کی نظر مجھ پر پڑی تو فرمایا کہ اے جابرؓ! ماہ رمضان کا یہ آخری جمعہ ہے اس کو وَداع یعنی رخصت کرو اور کہو: اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْهُ اٰخِرَ الْعَهْدِ

مِنْ صِیَامِنَا اِیَّاہُ فَاِنْ جَعَلْتَہٗ فَاجْعَلْنِیْ مَرْحُوْمًا وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَحْرُوْمًا" بارِ الٰہا! ہم تیری بارگاہ میں عاجزی سے درخواست کرتے ہیں کہ روزوں کے اس زمانہ کو ہماری عمر کا آخری زمانہ نہ قرار دینا اور اگر تو نے یہ مقدر کر دیا ہے تو پھر مجھ پر اپنی رحمت نازل فرما اور مجھے محروم نہ بنا۔

لڑکے: بے شک سر! آج کا دن بڑا مبارک دن ہے۔ ہم پورے خلوصِ دل سے عبادت بھی کریں گے اور دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ہر طرح کی نیکی دے بہت سا علم دے اور اصلی مسلمان بنا دے۔ ہمیں نماز اور روزہ اور سارے ہی احکامِ خداوندی پر عمل کرنے کی توفیق دے اور ہمارے ملک پاکستان کو خوب مضبوط بنا دے۔

ایک لڑکا: سر! یہ بتایئے کہ ماہ رمضان کے لئے کوئی شمسی مہینہ کیوں مقرر نہیں کیا گیا۔ چاند کے مہینہ میں تو پریشانی ہوتی ہے کہ کبھی جب ابر ہوتا ہے تو یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پہلی تاریخ کب ہے۔ شمسی مہینہ میں تو بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

ماسٹر صاحب: تم نے سوال تو بہت اچھا کیا ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ شمسی مہینوں کا زمانہ تو مقرر ہے جو مہینہ گرمی کا ہے وہ سردی میں نہیں

آتا اور جو سردی کا ہے وہ کبھی گرمی میں نہیں آتا اس لیے روزہ داروں کو ہر موسم میں ضبطِ نفس اور صبر اور بھوک پیاس کو برداشت کرنے کی عادت کیسے پڑتی اس لئے روزوں کیلئے قمری مہینہ ہی مقرر کیا جانا ضروری تھا تاکہ مسلمانوں کو سخت گرمی، سخت سردی، برسات اور دوسرے ہر موسم میں بھوک پیاس برداشت کرنے کی عادت پڑ جائے۔

دوسرا لڑکا: سر! اس کو ماہ صیام بھی تو کہتے ہیں۔ اس کے کیا معنی ہیں؟۔

ماسٹر صاحب: دیکھو! صیام۔ صوم کی جمع ہے۔ اس کے اصلی معنی کسی کام سے رک جانے کے ہیں چونکہ روزہ میں انسان اپنی بہت سی خواہشوں کو روک لیتا ہے اس لئے اسے صوم کہتے ہیں۔ اس کی جمع صیام ہے۔

تیسرا لڑکا: سر! یہ ماہ رمضان کے روزے کب سے فرض ہوئے تھے؟

ماسٹر صاحب: دیکھو اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ روزہ رکھنے کا تو اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہر امت کو حکم دیا تھا جیسا کہ خود قرآن میں اس کا ذکر موجود ہے مگر آنحضرتؐ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو رمضان میں روزے رکھنے کا حکم

۲ھ میں شعبان کے مہینہ میں آیا تھا۔ اُسی وقت سے یہ روزے قیامت تک کے لئے مسلمانوں پر فرض ہو گئے۔

چوتھا لڑکا: سر! یہ بتایئے کہ حضورؐ نے خود پہلا جمعہ کب پڑھایا تھا؟

ماسٹر صاحب: اچھا سوال ہے! دیکھو حضورؐ نے سب سے پہلے اُس وقت جمعہ کی نماز پڑھائی جب ربیع الاوّل کے مہینے میں آپ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے تھے وہ جمعہ ہی کا دن تھا۔

موذّن: اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر....

ماسٹر صاحب: لڑکو! بس اب خاموش! اذان سنو اور وعظ اور خطبے سننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ بہت اچھا سر!۔

خطیب صاحب: اردو کی تقریر شروع ہوئی ،۔ آج کا دن سال کے تمام دنوں سے افضل اور بہتر ہے اور حضورؐ نے اس میں عبادت اور استغفار اور خدمت خلق کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے حضورؐ نے اپنے مشہور صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہٗ سے فرمایا تھا کہ اے جابر آج کے دن ماہِ رمضان المبارک کو پورے خلوصِ دل کے ساتھ رخصت کرو اور اللہ کی بارگاہ میں استغفار اور دعا کرو۔ اللہ تبارک تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ حضرات! جمعہ کا دن پورے ہفتہ

کے سات دنوں میں سب دنوں کا سردار اور سیدالایام ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہوتی ہے اور رمضان کا ہر جمعہ دوسرے مہینوں کے جمعوں سے بدرجہا افضل ہے اور آج کا دن یعنی آخری جمعہ خود رمضان کے بھی ہر جمعہ سے افضل و بہتر ہے۔ اس لئے ہمیں دل لگا کر اس مبارک دن میں اللہ کی عبادت کرنا چاہیئے صوم کے اس مبارک زمانہ میں اللہ کی بے شمار برکتیں ہم پر نازل ہوتی ہیں۔ کاش ہم اُن برکتوں کو حاصل کرنے کے اہل بھی ہوں۔ آج کے دن کتنے ہی گنہگاروں کے گناہ ان کے نامۂ عمل سے دھو دیئے جاتے ہیں کاش ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہونے کی عزت حاصل کرسکیں۔ حضورؐ نے بار بار اپنے خطبوں میں ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ہم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ہم میں اگر کسی کو دوسرے پر فضیلت ہوسکتی ہے تو صرف کردار اور عمل ہی کے ذریعہ سے۔ اسلام کے نزدیک قوم، ملک، خاندان، زبان اور نسل اور امیر و غریب وغیرہ کا فرق کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے: "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" (الحجرات) تم میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہو۔" حضورؐ نے فرمایا ہے کہ

چھوٹوں کو بڑوں کا ادب کرنا چاہیئے اور بڑوں کو اپنے چھوٹوں پر رحم شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ حضرات! یہ اللہ کی بارگاہ ہے جس میں آپ سب با ادب حاضر ہیں۔ دنیا دیکھ لے کہ یہاں امیر و غریب اور سندھی پنجابی و بلوچی اور مہاجر و مقامی اور ملکی و غیر ملکی کا کوئی فرق موجود نہیں ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَيَدِہٖ" اور دوسری حدیث میں "مَنْ سَلِمَ النَّاسُ" فرمایا ہے یعنی سچا مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان یا دوسرے لوگ محفوظ رہیں اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم سب پورے اتحاد کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اللہ کے حقوق کے ساتھ اس کے بندوں کے حقوق بھی ادا کریں جب ہی ہم اس کے سچے مسلمان بن سکتے ہیں۔

سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جمعہ کے روز مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جمعہ کے دن ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت کی جائز دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ اکثر حدیثوں میں آیا ہے کہ یہ مبارک ساعت جمعہ کے دن کے آخری حصہ میں ہے ..

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ آج کا دن عید الفطر اور عید الاضحیٰ سے بھی افضل ہے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جمعہ ہی کے دن حضرت آدم علیہ السلام خلق ہوئے تھے اور اسی دن جنت میں داخل ہوئے اور اسی دن زمین پر انسان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے۔ حضورؐ نے حضرت جابرؓ سے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اُس پر جمعہ پڑھنا ضروری ہے سوائے بیمار اور مسافر یا عورت یا غلام اور نابالغ بچے کے اور جو شخص نماز جمعہ کو چھوڑ کر دنیا کے کاموں میں لگ جائے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنی رحمت سے جدا کر دے گا۔۔۔ حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت جس روز آئے گی وہ بھی جمعہ ہی کا دن ہوگا۔ اس لئے ہم سب کو جمعہ کے دن اور خصوصاً اس جمعۃ الوداع میں اللہ کی بارگاہ میں خوب خلوصِ دل کے ساتھ استغفار کرنا چاہیئے اور عبادت میں مشغول رہنا چاہیئے اللہ تعالیٰ ہم پر ضرور رحم و کرم فرمائے گا۔

(پھر خطیب صاحب نے دعا شروع کی) یا اللہ تو ہم سب کو سچا مسلمان بننے کی توفیق عطا فرما۔ ہم کو آپس میں متحد و متفق بنا دے۔ ہمارے آپس کے اختلافات کو دور فرما اور پاکستان کو زبردست استحکام عطا فرما اور تمام عالمِ اسلام کو آپس میں شیر و شکر کر دے، ہر مسلمان کے دل میں اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی محبت کا جذبہ پیدا کر دے۔ تو ہمیں اپنے

گناہوں سے بھی اور تیری مخلوق پر ظلم کرنے سے بھی محفوظ فرما۔ یا اللہ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تیری کتاب مقدس یعنی قرآن حکیم کی ہدایت پر عمل کریں۔

(پھر تو آمین آمین کا زبردست شور مچ گیا کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔)

سہیل: اشرف! دیکھتے ہو اُف! کتنا آدمی ہے! جہاں تک نظر جاتی ہے بس آدمی ہی آدمی دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا ٹھیک ہے اشرف! دیکھو تو! بس سر ہی سر نظر آرہے ہیں۔ کیسا اچھا لگ رہا ہے۔ سب کے سب سیدھی سیدھی صفوں میں کتنے ادب سے بیٹھے ہیں!۔

اشرف: ارے سہیل! تم تو بس سامنے ہی کی طرف دیکھ رہے ہو نا! ذرا پیچھے کی طرف تو دیکھو!۔ سمندر ہے آدمیوں کا سمندر!۔

ماسٹر صاحب: ارے! بس چپکے بیٹھو خاموش! دیکھو اب امام صاحب عربی کے دو خطبے پڑھیں گے جیسے میں تم کو بتا چکا ہوں۔

(خطبے ختم ہوئے) پھر نماز شروع ہو گئی۔ آدمیوں کے ایک سمندر نے اپنی صفیں درست کر لیں اور رکوع و سجود کر کے دونوں رکعتیں تمام کیں۔

(اب نماز ختم ہو گئی) جامع مسجد اور اس کے بڑے وسیع میدان سے آدمیوں کا ایک ریلا نکلا ایک زبردست شور و ہنگامہ کان پڑی آواز

نہیں سنائی دے رہی تھی بسیں، رکشے، ٹرک، موٹریں بھر بھر کے لوگ اپنے گھروں کو جانے لگے تاکہ افطاری کا انتظام کریں اور پھر نماز مغرب میں جانے کی تیاری کریں۔

(لڑکے اور ماسٹر کبیر الدین صاحب سب کے سب جامع مسجد کے کمپاؤنڈ سے باہر آگئے)

نعیم: نماز پڑھ لی سہیل تم نے؟ آؤ اب گھر چلیں۔ ماسٹر صاحب کو ادب سے سلام کرو۔

سہیل: پاپا کہاں ہیں بھائی جان! وہ دیکھو آ رہے ہیں! (پاپا بھی آگئے۔) (اب سب کے سب گھر آگئے)

شہلا: اخاہ! سہیل صاحب نماز جمعۃ الوداع پڑھ آئے۔ آج تو تمہاری صورت پر بڑا نور برس رہا ہے۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ سہیل کوئی دوسرے سہیل ہو گئے!۔

سہیل: آپا! وہ ٹڈی دل مجمع تھا نماز میں کہ کچھ حد ہی نہ تھی!۔ بس دور تک جہاں تک میں دیکھتا تھا تو سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ آدمیوں سے سارا میدان اور مسجد بھری ہوئی تھی آپا! آدمیوں کا ایک سمندر تھا!۔

شہلا: اچھا سہیل مجمع وجمع تو ہوتا ہی ہے۔ کراچی بہت بڑا شہر ہے! یہ کون سی نئی بات ہے! مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اس نماز جمعۃ الوداع سے کیا سیکھا؟۔

سہیل: آپا! میں نے یہ بات سیکھی کہ ہم سب کو نیک کام کرنا چاہیئے اور سب کو اتحاد و اتفاق سے رہنا چاہیئے۔ کسی کو تکلیف نہ پہنچانا چاہیئے۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر رحم کرنا چاہیئے اور وہ تمام کام کرنا چاہیئں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور آج کے دن یعنی جُمعۃ الوَداع میں کثرت سے عبادت اور استغفار کرنا چاہیئے۔ تمام نمازیں اور نماز جمعہ بھی پابندی کے ساتھ پڑھا کریں۔ اپنے ملک اور دین کے لئے ہم پر جو جو باتیں فرض اور ضروری ہیں ان کو انجام دینا چاہیئے۔ نماز جمعہ دو رکعت ہوتی ہے اس میں امام کے لئے دو خطبے نماز سے پہلے پڑھنا واجب ہے۔ نماز جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ حمد کے بعد سورہ جمعہ پڑھنا چاہیئے۔ جُمعۃ الوَداع سال کے تمام دنوں سے افضل ہے۔ وَداع کے معنی رخصت کرنے کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اس روز ماہ رمضان کو رخصت کیا جاتا ہے، اس روز خوب دُعائیں اور استغفار کرنا چاہیئے اور اللہ سے عہد کرنا چاہیئے کہ آئندہ ہم اس کا گناہ نہیں کریں گے۔ جمعہ کے دن اس کے آخری حصہ میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اُس میں جو جائز دُعا مانگی جاتی ہے وہ رد نہیں ہوتی اور ضرور قبول ہوتی ہے اور جمعہ کے دن نماز سے پہلے غسل کرنا چاہیئے اور صاف پاک کپڑے پہننا چاہیئں۔

شہلا : سہیل تم نے واقعی اور اصلی نماز ادا کی! ۔ دراصل نماز تو اسی شخص کی ہے جو نماز پڑھنے کا فیض حاصل کرے! ایسے لوگوں کو نماز سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا جو یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم نماز میں کس بڑی اور عظیم ترین ہستی کے سامنے کھڑے ہیں اور وہ ایسی ہستی ہے جو ہمارے دلوں کا حال بھی جانتی ہے اور وہ ہے ہمارا خالق اور ہمارا اللہ جسے ہم سمیع و بصیر کہہ کر پکارتے ہیں یعنی بڑا ہی سننے والا اور بڑا ہی دیکھنے اور جاننے والا۔

ملکی تحفظ

"ایک مسلمان کیلئے "ملکی تحفظ" ہر لحاظ سے اس کی زندگی کا مقدس ترین فرض ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ مقصود یہ ہے کہ اے ایمان والو تکلیفوں اور مصیبتوں پر صبر کرو اور جب دشمن کا سامنا ہو تو اس وقت بھی صبر و ضبط سے کام لو اور اس کے مقابلہ کے لیئے اور اپنے مادی دین و ملت کی حفاظت کیلئے پوری طرح مستعد اور آمادہ رہو اور صرف اللہ سے ڈرو تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ "ملک" عام طور پر ایک خاص خطۂ زمین کے لیئے بولا جاتا ہے جہاں کے لوگ ایک مخصوص آئین اور ملتے جلتے رسم و رواج کے رشتہ میں منسلک ہوں۔ ایک ملک میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی حیثیت سے ان کا ایک اقتدار اور ایک آئین کے ماتحت ہونا ضروری ہے اس لیئے اسلامی ملک سے مراد وہ خطۂ زمین ہوگا جہاں اسلامی عقیدہ رکھنے والے لوگ آباد ہوں یا جو اسلامی اقتدار کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہوں۔ "تحفظ" سے بچاؤ مراد ہے۔ اس

لفظ کے معنی بہت وسیع ہیں۔ فرد اور معاشرہ یا شخصی زندگی اور ایک پورے ملک کی حیات کا تحفظ مختلف صورتوں سے ہوتا ہے کبھی یہ تحفظ دشمن فوجوں کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور کبھی اس سے اندرون ملک کے فسادات اور داخلی خرابیوں سے حفاظت مقصود ہوتی ہے۔ ایک وطن پرست کا فرض اوّلین ہے کہ وہ اپنے ملک کو داخلی اور خارجی تمام دشمنوں سے بچانے کی کوشش کرے اور اس کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اندرونی دشمن باہر کے دشمنوں سے بہت زیادہ خطرناک ہوا کرتے ہیں۔

مضبوط درختوں کو آندھیوں کے جھٹکے مشکل ہی سے گراتے ہیں لیکن اگر ان کی جڑیں دیمک نے کھوکھلی کر دی ہوں اور انکی اندرونی طاقت ختم ہو چکی ہو تو طوفان نہیں بلکہ ہوا کا ایک معمولی سا تھپیڑا بھی اُن کو زمین پر گرا دینے کے لیئے کافی ہوتا ہے۔ اس لیئے شخصی تحفظ ہو یا قومی اور ملّی اور ملکی تحفظ یہ جس طرح بیرونی دشمنوں کے مقابلہ میں ضروری ہے اس سے بہت زیادہ اندرونی دشمنوں کے مقابلہ میں اہمیت رکھتا ہے کسی ملک کے اندرونی دشمنوں کی بہت سی قسمیں ہوا کرتی ہیں۔

اس کا افلاس، آپس کی پھوٹ، اخلاقی کمزوریاں، فضول خرچی، رنگ رلیاں، خود غرضی اور مفاد پرستی یہ سب چیزیں ملک، قوم اور معاشرہ کی تباہی

کا سبب بنتی ہیں اور بیرونی دشمنوں سے بہت زیادہ ملکی سالمیت کے لیے خطرناک ہوتی ہیں۔ اگر ملک کے رہنے والوں کی احتیاج اور تنگدستی دور ہوگی تو ان میں جرأت مقابلہ پیدا ہوگی، اُن سے فرقہ بندیوں اور آپس کی پھوٹ کے جراثیم دفع ہوں گے، اِن میں اتحاد و برادری کے جذبات ظاہر ہوں گے اور ملک کے عوام ایک ٹھوس آہنی دیوار کی شکل اختیار کرلیں گے۔ ان میں خیانت اور غدّاری نہ ہوگی تو وہ ہر دشمن کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ اُن میں فضول خرچی کی عادت نہ ہوگی تو اُن کی کمائی آڑے وقتوں میں کام آئے گی اور بُرا وقت آنے پر وہ کسی دوسرے کے رحم و کرم کے محتاج نہ رہیں گے لیکن اس کے برخلاف جو معاشرہ رنگ رلیوں کا دلدادہ ہو، جو مادّی لذتوں کی پرستش میں مشغول ہو جسکو اپنے مادّی دشمن تو نظر آتے ہوں لیکن وہ روحانی دشمن جو ان ظاہری دشمنوں سے کہیں زیادہ مہلک اور سفّاک ہوں دکھائی نہ دیتے ہوں اس میں قوت مقابلہ کسی حال میں بھی باقی نہیں رہ سکتی۔

ملکی "تحفّظ" کا نظریہ بڑا گہرا ہے۔ اسکا سلسلہ بہت وسیع اور اس کی بنیادیں بہت دور تک جاتی ہیں - یہ اس وقت تک صحیح معنی میں ممکن ہی نہیں ہے جب تک کسی ملک کا معاشرہ درست نہ ہو اور معاشرہ کی اصلاح کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ اسکا ہر ہر فرد جس طرح اپنے بیرونی دشمنوں کو پہچاننے اور اُن کا

مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اُسی طرح اپنے اندرونی دشمنوں کو بھی پہچانئے اوران پر فتح حاصل کرنے کی بھرپور سعی کرے۔ اس بنیادی تحفّظ کے بعد جس میں قدم قدم پر انسان کو اپنے داخلی بدترین دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے پھر اُسکے لیئے بیرونی دشمنوں سے تحفّظ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ملک کے عوام کا شعور اتنا بیدار ہونا چاہیئے کہ وہ دشمن کو ہر روپ میں پہچان لیں اور ہر لباس میں اُسکو تاڑ جائیں۔ اسلامی ہدایات اس سلسلہ میں صاف اور واضح ہیں، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء آیہ ۲۹) اپنے نفسوں کو ہلاک نہ کرو۔ دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے: وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ آیہ ۳۲) جس نے ایک نفس کو جلا لیا تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ کر دیا اسطرح ہلاکت اور زندگی کے اسباب و وسائل جاننا انسان کا پہلا فرض ہے تاکہ وہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو ہلاکت و بربادی سے بچا سکے اور زندگی کے دشمنوں کا مقابلہ کرسکے۔ قرآنِ کریم نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیئے کچھ اصول اور حدود مقرر کردیئے ہیں جن سے تجاوز کرنے کی کسی شخص کو بھی اجازت نہیں ہے: وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ آیہ ۲۲۹) ظالم وہی لوگ ہیں جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں۔

اِن ہی حدوں کی پابندی کا نام ایمان ہے، اور جب تک اس پابندی کے امتحان میں کوئی شخص پورا نہ اترے گا اس وقت تک وہ حقیقی مومن نہیں کہا جا سکتا۔

یہی حدود ہیں جن سے اسلامی معاشرہ کی تخلیق ہوتی ہے اور یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر اسلامی نظام زندگی کی تعمیر کی گئی ہے۔ "ملکی تحفظ" دوسرے الفاظ میں اسی نظام زندگی کی حفاظت کا نام ہے جس کے سایہ میں اُس ملک کے رہنے والے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ داخلی تحفظ کے ساتھ اسلام نے خارجی تحفظ کو بھی ایک خصوصی نوعیت عطا کی ہے۔ یہ خارجی تحفظ صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب عوام میں یکجہتی، خود اعتمادی، خدا پر بھروسا اور مشکلات پر صبر کرنے کی پوری صلاحیت و طاقت موجود ہو۔ باہمی اخوت و تنظیم اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران آیۃ ۱۰۳)

خدائی رشتہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو اور باہمی نظم و ضبط کو برباد نہ کرو۔ دوسری جگہ اس طرح فرمایا ہے، وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا (انفال/۴۶) اللہ اور رسولؐ کا کہا مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو کیونکہ اگر تم نے باہمی جھگڑے پیدا کیئے تو تم ہمت ہار جاؤ گے۔ ملک کی سالمیت کیلئے عوام کی انفرادی اور اجتماعی اصلاح اور ان کی باہمی تنظیم بے حد ضروری چیز ہے۔ ہمیں قرآنِ کریم نے ہدایت فرمائی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں اور جو ایک حقیقی بھائی کے حقوق ہو سکتے ہیں انھیں پوری طرح ادا کریں ہمیں رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بتایا ہے کہ ہم سب مسلمان ایک جسد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح جسم کا ایک عضو دکھتا ہے تو سارا جسم

میں اس کی تکلیف کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کی تکلیف پورے اسلامی معاشرے کی تکلیف ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر ہر مسلمان کا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ وہ جس طرح اپنا تحفظ کرتا ہے اور اپنی جان و مال، عزت و آبرو اور اپنے گھر بار کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اسی طرح اپنے دوسرے بھائیوں کی بھی حفاظت کرے۔ اسی کا نام ابتدا میں ذاتی تحفظ ہوتا ہے اور پھر آخر میں وہ ایک قوم و ملّت اور ایک ملک کے تحفّظ کے نام میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ تحفّظ ایک مسلمان کے لیئے خدا کی سب سے بڑی امانت ہے جو اُس کے سپرد کی گئی ہے۔ اپنے ملک کی حفاظت کرنا، اپنے بھائیوں کی نصرت و امداد کرنا اور ان کے ناموس کی عزت و آبرو کا بچاؤ کرنا ہر مسلمان کا دینی فرض ہے۔ یہ جہاد کی دوسری قسم ہے۔ جس کا نام "دفاع" ہے۔ اس دفاعی جہاد کیلیئے امام یا نبی کے ہونے کی اور اُن سے خصوصی اجازت حاصل کرنے کی شرط نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جب کبھی اسلامی مملکت اور مسلم قوم کو دشمنوں سے خطرہ ہو تو وہ شمشیر بکف ہو کر میدان میں نکل آئے اور اپنے دین اور ملک کی حفاظت کرے یہ دفاع اسی طرح واجب ہے جس طرح خود جہاد واجب ہے، اور اس دفاعی جنگ اور اس کے واجب و لازم ہونے میں عورت، مرد، بچے اور بوڑھے، بیمار و تندرست کسی کی بھی کوئی قید نہیں ہے جس شخص

سے بھی جس طرح ممکن ہو وہ اسلامی ملک اور اسلامی تہذیب و تمدن کی اور اسلامی سرزمین کے چپّہ چپّہ کی حفاظت کرے۔ حضرت رسولؐ اکرم جب مکّہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے تھے تو آپ کے ساتھ گنتی کے چند لوگ تھے جن میں نہ تنظیم تھی اور نہ دشمن سے مقابلہ کرنے کیلئے اسلحہ تھا لیکن حضورؐ کی عظیم قیادت نے چند ہی روز میں اُن منتشر اور غیر منظم لوگوں میں ایسی روح پھونک دی کہ اُن مٹھی بھر بھوکے اور غریب و منتشر مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ کے قصروں میں زلزلے ڈال دیئے اِس لئے کہ انھیں قیادت پر مکمل بھروسا تھا، اُن میں یقین محکم تھا وہ خدا کے سوا کسی طاقت سے مرعوب نہ تھے۔ اسلام دینِ امن و صلح ہے۔ وہ دنیا میں خونریزی اور بربادی کا پیغام نہیں لایا ہے اس کی پوری تاریخ میں کوئی جنگ بھی جو ہجرت رسولؐ سے لے کر آپ کی وفات تک لڑی گئی ہو جارحانہ نہ تھی یہ تمام لڑائیاں دفاعی تھیں جب تک امکان رہا صلح و آشتی سے کام لیا گیا مگر جب مجبور کیا گیا تو تلوار اٹھانا پڑی۔ قرآن مجید کا اعلان ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (انفال/۶۱) اگر دشمن صلح کرنا چاہے تو تم بھی صلح کرو اور خدا پر بھروسا رکھو اور دوسری جگہ یہ ہے: فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (نساء/۹۰) اگر تمہارے دشمن

تم سے کنارہ کشی کریں اور تم سے نہ لڑیں اور تمہارے پاس صُلح کا پیغام بھیجیں تو پھر تمہارے لیئے ان کو تکلیف دینے کی اجازت نہیں ہے اسلام کا پہلا اور آخری پیغام صرف امن وسلامتی ہے اسکی غرض تخریب اور فساد نہیں ہے وہ دنیا میں نسل انسانی کی بربادی کا ارادہ لیکر نہیں آیا۔ اس کا مقصد تعمیر اور اس کی غرض اخوت و برادری کی تعلیم ہے مگر ساتھ ہی یہ جذبۂ امن اور یہ کوشش صلح صرف اسی حد تک ممکن ہے، جہاں تک دنیا اس جذبہ سے جائز فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے لیکن جب اپنا وجود خطرہ میں ہو جب اپنی زندگی مٹ رہی ہو، جب اپنی اور اپنے بھائیوں اور بہنوں کی عزت و آبرو پر آنچ آرہی ہو تو اس وقت مسلمان کا یہ نعرہ ہوتا ہے: اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ۔" جنت تلواروں ہی کے سایہ میں ہے۔ وہ مسلمان ہی نہیں جو اپنے ملک دین کو مٹتے ہوئے دیکھ سکے۔ وہ مسلمان ہی نہیں جو غیر مسلموں کی غلامی پر فخر کرے۔ قرآن کریم نے ہمیشہ اعلان امن و صلح کیا ہے لیکن جب جنگ پر مجبور کر دیا جائے تو دفاع کرنا ہر اس شخص پر واجب و لازم ہو جاتا ہے جو خدا پر ایمان رکھتا ہو۔ اس وقت اللہ کا یہ حکم ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ

اے ایمان والو جب تم سے میدان جنگ میں تمہارے دشمن سے

مقابلہ ٹھن جائے تو یاد رکھو کبھی پیٹھ نہ پھیرنا کیونکہ ایسے شخص کی سزا جو میدان جنگ سے بھاگ جائے جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سچے مسلمان کا ایمان ہے کہ خدا اس کے ہر عمل سے باخبر ہے اس کے کانوں میں اس آواز کی گونج ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ (حدید/۴) اللہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔ اور پھر اس کو قرآن حکیم کا یہ ارشاد بھی یاد ہے:
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (الصف/۴) اللہ یقیناً ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ جنگ کرتے ہیں کہ گویا وہ مضبوط و مستحکم دیواریں ہیں۔ اسلام نے کبھی جارحانہ جنگ کی تلقین نہیں کی، مگر ساتھ ہی ہمیشہ دفاعی جنگ کے لئے تیاری کا حکم دیا ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ (انفال/۶۰) اپنے دشمن کے مقابلہ کے لئے جہاں تک تمہارے امکان میں ہو قوت اور طاقت اور لشکر حاصل کرو کہ تم اپنی طاقت و قوت سے خدا کے دشمن، اپنے دشمن اور دوسرے ایسے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھالو جنہیں تم نہیں جانتے مگر خدا ان سے واقف ہے اور جو کچھ بھی تم خدا کی راہ میں صرف کردگے اس کی پوری جزا تمہیں خدا

کی بارگاہ سے عطا ہوگی اور تم پر کسی طرح بھی ظلم نہیں کیا جائیگا۔

اسلام کی امن دوستی اس حدیث رسولؐ سے پوری طرح آشکار ہے: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔" سچا مسلمان صرف وہ شخص ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔ اس کی صلح پسندی قرآن حکیم کے اس اعلان سے اچھی طرح واضح ہو چکی ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ (التوبہ/٦) اگر کوئی مشرک (جو تمہارا بدترین دشمن ہے) وہ بھی تم سے پناہ طلب کرے تو تم اس کو بھی پناہ دیدو۔ ایسی قوم اور ایسا دین جس کی یہ تعلیم ہو اس کے متعلق کوئی ذی ہوش کبھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ صلح کش اور تخریب پسند ہے کیونکہ اپنا دفاع کرنا تو ہر جاندار کی فطرت میں داخل ہے اور مسلمان تو اس دفاع کو اپنا دینی فرض بھی سمجھتا ہے ہمارے مقدس رسولؐ نے ہمیں بتایا ہے کہ "حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ" وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے اور کبھی ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: مِنْ اِیْمَانِ الرَّجُلِ حُبُّہٗ لِقَوْمِہٖ۔ مومن کے ایمان کی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنی قوم سے محبت رکھے اس محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی مسلم قوم اور اپنے اسلامی وطن اور ملک کی حفاظت کرنا بھی ہر مسلمان اپنا دینی اور

ایمانی فرض سمجھے اور اپنے اس ایمان کا عملی ثبوت بھی دے۔

پاکستان دنیا کی اہم ترین اسلامی مملکت ہے اس ملک کی سرزمین ملّتِ اسلامیہ کا ایک عظیم مرکز ہونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ "بلد اسلام" ہے اور اس کا ایک ایک چپّہ ہمارے لئے بڑی قیمت رکھتا ہے اس لئے صرف ہماری بہادر اور جانباز فوجوں ہی کا نہیں بلکہ ہر پاکستانی مسلمان کا دینی اور اسلامی فرض ہے کہ وہ اپنی محبوب اسلامی مملکت کی عزت و وقار کے تحفّظ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کرے اور اپنے کوہ شکن عزم و استقلال اور اپنی تاریخی اور مثالی ہمت و جرائت و شجاعت سے کام لیکر اپنے ملک کے دشمنوں کو بتا دے کہ اس مملکت پر بری نگاہ اٹھانا آسان کام نہیں ہے اور اپنے اُس فرض کو پورا کرے جو اُس کے اللہ نے اور اس کے دین نے اُس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔

شہادت کے فضائل

اللہ نے سورہ آل عمران آیہ ۱۴۰/۱۴۱ میں فرمایا ہے "وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُہَدَآءَ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۱﴾" یعنی اہل ایمان کو اگر کبھی شکست اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو محض اس لیے کہ اللہ اُن کے ایمان کی جانچ کرنا چاہتا ہے کہ اس میں کس قدر پختگی اور استحکام ہے اور یہ یہ بھی چاہتا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگوں کو مرتبہ شہادت بھی حاصل ہو اور اللہ ظالموں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ایمان والوں کے ایمان کو خالص اور پاک و پاکیزہ بنا دے۔ اور کافروں کو مٹا ڈالے۔

پھر سورۂ نساء آیہ ۶۹ میں ارشاد ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت اور پیروی

کرتے ہیں تو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ کا خاص انعام و اکرام ہے یعنی پیغمبر، صدّیق شہداء اور تمام نیک لوگ اور یہ سب کیسے اچھے ساتھی ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے اُس کا فضل وکرم ہے۔

سورۂ حدید آیہ ۱۹ میں اس طرح فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور اُس کے پیغمبروں پر پورا ایمان رکھتے ہیں وہی لوگ اپنے پروردگار کے نزدیک صدّیق اور شہید ہیں۔ اُن کے لیئے ان کا خاص اجر و ثواب اور خاص نور ہوگا۔

سورۂ بقرہ آیہ ۱۵۵/۱۵۶ میں آزمائش اور امتحان میں جان و مال کی قربانیاں دینے والوں کے مرتبہ اور منزلت کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: اور ہم ضرور تمہاری آزمائش کریں گے کچھ خوف اور کچھ بھوک سے اور کچھ مال اور جان اور پھلوں کے نقصان سے اور ایسے صبر کرنے والوں کو (اے رسولؐ) خوشخبری دیدو جن پر کبھی کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو بس یہی کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ ہی کے لیئے ہیں اور یقیناً ہم اُسی کی طرف پلٹ کر

جانے والے ہیں ۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار
کی جانب سے عنایتیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ
ہیں جو ہدایت پر ہیں ۔ سورۂ آلِ عمران آیہ ۱۲۹ میں اللہ نے
شہیدانِ راہ حق کے مرتبہ کا اس طرح ذکر فرمایا ہے جس کا
ترجمہ یہ ہے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کیے گئے ہیں
انہیں تم ہرگز مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ اپنے پروردگار
کے پاس زندہ ہیں اور رزق پاتے رہتے ہیں اور وہ اُن
نعمتوں پر خوش ہیں جو اللہ نے اپنے فضل و کرم سے انھیں
عطا فرمائی ہیں اور جو لوگ ابھی تک اُن کے پاس نہیں
پہنچے اور پیچھے رہ گئے ہیں وہ اُن کی اس حالت سے مسرور
اور خوش ہیں کہ اُن پر نہ تو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے
وہ اللہ کے انعام اور فضل پر خوش ہوتے ہیں اور اس بات
پر بھی کہ اللہ ایمان والوں کا اجر و ثواب ضائع نہیں کرتا۔
یہ آیاتِ قرآنِ پاک جن لوگوں کی صفتیں اور فضیلتیں
بیان کر رہی ہیں در حقیقت یہی وہ لوگ ہیں جن کو اسلام
شہید راہ خدا کہتا ہے اور جن کی ابدی حیات پر پورے
عالمِ اسلام کا اجماع و اتفاق ہے ۔ یہ وہ پاک انسان ہیں

جو غیر اسلامی اور خالص دنیوی اغراض کے لیئے ہرگز نہیں بلکہ خالص الٰہی اور دینی مقاصد کے لیئے اپنی جان اور اپنے مال کی قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو صرف خوشنودی خدا کے لیئے اپنی جانیں راہ حق میں پیش کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے ایسے مرنے والوں اور ایسے صبر کرنے والوں کے لیئے قیامت آنے سے پہلے ہی عالم برزخ میں ابدی حیات کا اعلان کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حیاتِ ابدی اور یہ نعمتیں انھیں اسی لیئے ملتی ہیں اور ملیں گی کہ انھوں نے صبر کیا، استقلال و جرأت سے کام لیا اور اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ دنیا نے انھیں اپنی طرف مائل کرنے کی ہر طرح سے بھرپور کوشش کی مگر خوف اور لالچ کے ہر سیلاب میں وہ پہاڑوں اور چٹانوں کی طرح اپنی جگہ کھڑے اور جمے رہے اور آگ اور خون کے بے پناہ طوفان بھی انھیں راہ حق سے نہ ہٹا سکے۔ ایسے سچے اور پکے اہل ایمان اگر ہر دور میں نہ پیدا ہوتے تو آج یہ پوری دنیا ایک ایسا جہنم بن جاتی جس میں انسانیت کی تمام قدریں بہیمیت کی آگ میں جل کر ہمیشہ

کے لیئے ناپید اور فنا ہو جائیں۔

اسلام نے ہمیں اس کی تعلیم دی ہے کہ دنیوی زندگی کا اصلی مقصد صرف یہ ہے کہ وہ اخروی زندگی اور رضائے خداوندی کا وسیلہ قرار دی جائے اور اسی لیئے حدیث میں یہ ارشاد ہوا ہے: الدنیا مزرعۃ الآخرۃ یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مادی حیات کو اس طرح بسر کیا جائے کہ یہ حصول نعمات اُخروی کا ذریعہ بن جائے یعنی دنیا کی زندگی کا اصلی مقصد تحصیل دنیا اور طلب دنیا ہی نہ ہو بلکہ اس کا ایک ایک لمحہ خوشنودی خدا اور تحصیل آخرت کیلئے صرف کیا جائے دوسرے لفظوں میں حقیقی مسلمان وہی شخص ہے جس کی دنیا آخرت کے مقصد کے لیئے ہو اور صرف تحصیل دنیا اصلی غرض نہ ہو اور انسان اس حقیقت کو سمجھ لے اور اس راز سے پوری طرح آگاہی حاصل کر لے کہ اُس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ صرف اللہ ہی کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم اور خوشنودی کی راہ میں اسے صرف ہونا چاہیئے خواہ وہ اُس کی جان ہو، مال ہو یا اولاد و اقربا ہوں۔ سورۂ توبہ آیہ/۱۱۱ میں

اسی نظریۂ حیاتِ ابدی کی طرف اشارہ ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ نے اہل ایمان سے اُن کی جانوں اور مال و دولت کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ انھیں اس کے عوض میں جنت کی نعمتیں عطا ہوں گی۔ یہ اہل ایمان وہی لوگ ہوا کرتے ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ سورۂ نسآء میں یہ الفاظ ہیں، "وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا" اور جو لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں شہید ہو جاتے ہیں یا کفار و مشرکین پر غالب آجاتے ہیں تو ہم انھیں اس کے عوض میں اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ اسی طرح سورۂ آل عمران آیہ ۱۹۵/ کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اپنے وطن سے ہجرت کر کے نکل گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور شہید کیے گئے تو اللہ فرماتا ہے کہ میں ضرور اُن کے گناہ بخش دوں گا اور انھیں جنت میں داخل کروں گا۔"

شہادت کے عظیم مرتبہ اور بلند ترین منزل کو سرورِ کائنات کی ایک حدیث نے کس قدر وضاحت کے

ساتھ ان لفظوں میں سمجھا دیا ہے : وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ"۔ تمہیں اس بات کو جان لینا چاہیئے کہ جنّت تلواروں کے سایہ ہی میں ملا کرتی ہے۔

کسی شخص نے حضورِ انور سے عرض کی کہ جنگ کے مختلف انفرادی اور اجتماعی اسباب ہوا کرتے ہیں تو آخر کونسی جنگ جہاد ہے اور کونسی موت شہادت ہے؟ آپ نے فرمایا: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ جو شخص اعلائے کلمۃ اللہ یعنی اللہ کی بات کو سب سے بلند رکھنے کے لیئے جنگ کرے تو اُسی کی یہ جنگ جہادِ راہ خدا ہے۔ فضائل شہادت کے سلسلہ میں سرورِ کائنات نے فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس خیر سے بڑھ کر کوئی خیر نہیں کہ انسان راہ خدا میں شہادت کا درجہ حاصل کرے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے جو شخص جنّت میں جائے گا وہ شہید ہے۔

شہادت کی فضیلت میں بے شمار حدیثیں موجود ہیں جن میں چند یہ ہیں:۔

جنّت میں ایک دروازہ ہے جس سے صرف شہدا

داخل ہوں گے۔ انسان کی بہترین موت شہادت ہے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت ہے کہ دو قسم کے قطروں سے زیادہ اللہ کسی چیز کو دوست نہیں رکھتا۔ ایک وہ خون کا قطرہ جو جہاد راہ خدا میں بہے دوسرے وہ آنسو کا قطرہ جو رات کی تاریکی میں خوف خدا سے بہے۔

سرور کائنات نے فرمایا ہے کہ جب مسلمان غازی جام شہادت نوش کرنے کے لیے میدان کی طرف جاتے ہیں تو اللہ کی بارگاہ سے بخشش اور اس کی رضا کا پروانہ انھیں پہلے ہی مل جاتا ہے اور انھیں میدان جہاد میں ایک ایک دن کا ثواب ہزاروں سال کی عبادت کے برابر عطا کیا جاتا ہے۔ اور وہ زخموں سے چور ہو کر زمین پر گرتے ہیں تو انھیں اُس اجر و ثواب کی بشارت بارگاہ خدا سے ملتی ہے جسے نہ تو کسی نے آنکھوں سے دیکھا اور نہ کانوں سے کبھی سنا ہو اور نہ دل میں کبھی ایسے عظیم ثواب کا خیال بھی گذر سکا ہو۔ آج عاشور محرم ہے نواسۂ رسول اللہ کربلا کے چٹیل میدان میں تین دن کی بھوک اور پیاس میں اپنے بھوکے اور پیاسے ساتھیوں کے ساتھ دین حق کو بچانے

اور سیرتِ محمدیؐ کو زندہ رکھنے کے لیئے جان و مال کی قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔ پیاسے چھوٹے بچے ہاتھوں میں سوکھے ہوئے مشکیزے لیئے ہوئے ہائے پیاس! ہائے پیاس! کی فریاد کر رہے ہیں، سورج کی شدید ترین گرم شعاعوں نے ہر ذرۂ صحرا کو تنور کی طرح بھڑکا دیا ہے۔ شہیدوں کی لاشیں خیام حسینی کے پاس زمین پر خون میں ڈوبی ہوئی پڑی ہیں اور فرزند رسولؐ بار بار استغاثہ کی آواز بلند کر رہے ہیں مگر یزید کی بے رحم فوج کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ حسینؑ کی ہر نصیحت کا جواب تیروں، تلواروں، پتھروں اور نیزوں سے دیا جا رہا ہے۔ آخر جب خاندانِ نبوت کے تمام افراد اور کل انصارِ حسینؑ شہید ہو گئے تو امام اپنی گود میں اپنے پیاسے چھ ماہ کے فرزند حضرت علیؑ اصغر کو لائے اور فوج یزید کو آواز دی کہ کم از کم تم اس ننھے سے بچے پر تو رحم کرو اور اسے پانی دیدو۔ مگر ظالموں نے اس معصوم ننھی سی جان کو بھی تین بھال کے زہریلے تیر کا نشانہ بنا دیا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر امام حسینؑ کے قدمِ استقلال میں

جنبش نہ ہوئی اور یزیدؑ کی طاغوتی طاقت نہ فرزندؑ رسولؐ کو اور نہ اُن کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اپنے سامنے جھکا سکی۔

بیشک حسینؑ اور انصارِ حسینؑ کربلا میں شہید ہو کر خود زندگیِ دوام کے مالک بن گئے اور اسلام کو بھی زندہ کر گئے۔

سر داد نہ داد دست در دستِ یزیدؑ
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

اعلائے کلمۃ الحق

مردِ مؤمن کا مقصدِ زندگی صرف اعلائے کلمۃ الحق ہے اور اس کی موت بھی اسی راہ پر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ کلمۃ الحق درحقیقت کلمۃُ اللہ ہے اور بلندی اور برتری صرف اسی کے لیے ہے۔ قرآنِ کریم کا فرمان ہے: وَکَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا سورۂ توبہ آیہ ۴۰ اللہ ہی کی بات سب سے اونچی ہے، اسی بلندی کی طرف جانا تلوار اور نفس دونوں قسم کے جہادوں کا حاصل ہے۔

کسی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی۔ حضورؐ! جنگ کے مختلف انفرادی اور اجتماعی اسباب ہوا کرتے ہیں تو آخر پھر کونسی جنگ جہاد کہلاتی ہے اور کونسی موت شہادت ہے۔ فرمایا: مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ " جو شخص اعلائے کلمۃُ اللہ یعنی اللہ اور حق کی بات کو بلند کرنے اور بلند

رکھنے کے لیئے جنگ کرے تو اسی کی جنگ جہادِ راہِ خدا ہے۔

بلاشبہ شہادت کا اصلی اور بنیادی مقصد اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ حضورؐ انور کا ارشاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اس چیز سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں ہے کہ ایک مسلمان اللہ کی راہ میں شہادت کا درجہ حاصل کرے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ سب سے پیشتر جو شخص جنّت میں داخل ہوگا وہ شہید ہے۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب مسلمان غازی جامِ شہادت نوش کرنے کے لیئے میدانِ کارزار کی طرف بڑھتا ہے تو اللہ کی بارگاہ سے بخشش اور رضا کا پروانہ اُسے پہلے ہی مل جاتا ہے اور اُسے میدانِ جہاد میں ایک ایک دن کا ثواب ہزاروں سال کی عبادت کے برابر عطا ہوتا ہے، پھر جب وہ زخموں سے چور ہو کر زمین پر گرتا ہے تو اس کو اس اجر و ثواب کی بشارت بارگاہِ خداوندی سے ملتی ہے جسے نہ تو کسی نے کبھی آنکھوں سے دیکھا ہو اور نہ کانوں سے کبھی سنا ہو اور نہ دل میں کبھی ایسے عظیم ثواب کا خیال

تک آسکا ہو۔ یہ اجر و ثواب اُسے صرف اس لیئے ملتا ہے کہ اس کی موت اعلائے کلمۃُ الحق کیلیئے ہوئی ہے، وہ اللہ کے دین اور حق و دیانت کی آواز کو بلند کرنے کے لیئے اپنا خون بہاتا ہے اور اپنی جان قربان کرتا ہے۔

کربلا کی قربانی بھی کسی دنیوی مقصد کے لیئے نہیں، کسی مادّی غرض کے لیئے نہیں، تاج و تخت کے حصول کے لیئے نہیں، مال و دولت کے خزانے لوٹنے کے لیئے نہیں اور عیش و عشرت اور حکومت و سلطنت کی طلب میں نہیں بلکہ محض کلمۂ حق کے بلند کرنے اور اسلام کے پرچم کو اونچا رکھنے کے لیئے تھی۔

امتِ مسلّمہ کے لیئے وہ بڑا امتحانی وقت تھا جب نواسۂ رسوؐل اللہ نے کربلا کے میدان میں یہ عظیم اور لاثانی قربانی پیش کی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب رسوؐل اسلام کی محنت اور اللہ کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں کی محنتیں بربادی کے دروازہ پر آچکی تھیں۔ جب اسلام کی نقاب ڈال کر اس کے دشمن، یزید اور اس کے ساتھیوں کے روپ میں حق و دیانت کی جڑوں کو کاٹ رہے تھے،

جب اذان کی آواز، رقص و سرود کے نغموں میں دبی جارہی تھی، یادِ الٰہی کی محفلوں کے بجائے شرابِ ناب کے قصیدے پڑھے جارہے تھے، اولادِ رسولؐ اور صحابہؓ کرام کا قتل جائز بنا دیا گیا تھا۔ اقتدار کے نشہ میں یزید یہ نعرہ لگا رہا تھا: لَعِبَتْ هَاشِمُ بِالْمُلْكِ فَلَا خَبَرٌ جَاءَ وَلَا وَحْيٌ نَزَلَ۔ یعنی بنی ہاشم ملک و دولت کا ایک کھیل کھیلے تھے (معاذ اللہ) نہ کوئی وحی اتری تھی اور نہ کوئی الٰہی پیغام آیا تھا۔

اس نازک ترین مرحلہ پر فرزندِ رسولؐ حضرت امام حسینؓ اور آپ کے وفادار ساتھیوں نے صرف اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر اپنے مقدس خون کا آخری قطرہ تک اللہ کی راہ میں پیش کر دیا۔

تین روز کی بھوک اور پیاس میں امام عالی مقام اور آپ کے چند ساتھیوں نے جس بہادری، حق آگاہی، خودداری اور استقلال و جرأت کے ساتھ یزید کی فوج کا مقابلہ کیا اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے عدیم المثال قربانیاں پیش کیں جن کی نظیر تاریخ نہیں

لا سکتی۔

بلاشبہ حضرتِ سید الشہدا امامِ حسین علیہ السلام نے حق و باطل کے درمیان اپنے خون سے ایک ایسی حدِّ فاصل بنادی ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اور بقائے دوام اس کا مقدّر ہے۔

قومی اتحاد کی بنیادیں

درحقیقت قومی اتحاد کی بنیادیں بھی وہی ہیں جو اسلام و ایمان کی اصلی بنیادیں ہیں ۔ اگر ہم اسلام اور ایمان کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لیں اور اُن کی فکری اور عملی بنیادوں کا پتہ لگالیں تو پھر ہمیں قومی اتحاد کی بنیادوں کو تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی ۔

قرآن نے اس کا بارہا اعلان کر دیا ہے کہ اللہ نے انسان کے لیئے اُس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی کچھ حدیں مقرر کر دی ہیں اور ایسے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا ہے جس میں سے بعض کا تعلق اللہ اور اُس کے بندوں سے ہے اور بعض کا تعلق اس کے بندوں ہی میں ایک دوسرے سے ہے ۔ جنہیں دوسرے لفظوں میں ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد کہتے ہیں ۔ یہی پابندیاں اور حقوق و فرائض قرآنی زبان اور اسلامی اصطلاح میں حدود اللہ کہلاتے

ہیں اور جو شخص ان حدوں کی بھرپور پابندی کرے گا وہی سچا مسلمان ہو سکے گا۔ اس کے برخلاف جو ان حدود سے تجاوز کرے گا اور ان کی خلاف ورزی کرے گا وہ صحیح معنی میں ہرگز مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔

سورۂ نسآء میں اللہ کا فرمان ہے: وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ "یعنی جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرے اس کو اللہ جہنم کی آگ میں داخل کرے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیئے جہنم کا عذاب ہے۔

اگر تھوڑا سا بھی غور کر لیا جائے تو یہ بات آسانی کے ساتھ ہماری سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ان الٰہی حدود کا تعین ضروری نہیں ہے کہ ہر موقع اور ہر محل پر ہماری مرضی اور ہماری خواہش ہی کے مطابق ہو بلکہ زیادہ تر ایسی ہی صورتیں پیش آتی رہیں گی جہاں ہماری خواہش نفس ان حدودِ خداوندی سے ٹکرائے گی اور اس وقت ہمارے

ایمان کی جانچ اسی بات سے ہوگی کہ ہم اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کریں اور صرف اُس بات کو مانیں جس کا اللہ اور رسُول نے حکم دیا ہو۔

اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے تمام جذبات ہماری ہوائے نفس کے تابع نہ ہوں بلکہ عقل و شرع اور حکم الٰہی کے تابع ہو جائیں۔ بلاشبہ یہی وہ اصلی مرکز ہے جہاں ہم انفرادی اور اجتماعی فلاح حاصل کر سکتے ہیں اور خود بھی ایک معتدل، خوشحال اور امن و سلامتی کی زندگی گذار سکتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی اسی طرح کی زندگی اور اسی طرح کی فلاح و سلامتی کا سبب بن سکتے ہیں۔ حدُودِ الٰہی کی خلاف ورزی، اپنے حدود سے تجاوز اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی محض اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ انسان یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے اوپر بھی کوئی طاقت ہے اُس سے بالاتر اور قوی تر بھی کوئی حاکم ہے اور خود اس انسان کا کوئی فیصلہ بھی حرفِ آخر نہیں ہے بلکہ وہ ہر قول و عمل کے لیے اپنے پروردگار کے حضور جوابدہی کا ذمہ دار ہے۔ اُسے یہ یاد نہیں رہتا کہ دنیا میں کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں اور وہ بھی

اللہ کے اُسی طرح بندے ہیں جس طرح وہ ہے اور اُن کے لیئے بھی اللہ نے وہی حقوق رکھے ہیں جس طرح خود اُس کے ہیں اور اُس انسان کو ان حقوق اور حدود سے تجاوز کرنے کا حق حاصل نہیں۔ چونکہ آدمی کچھ غلط فہمیوں کا شکار ہو کر ان حقیقتوں کو فراموش کر دیتا ہے اس لیئے اجتماعی زندگی میں باہمی افتراق اور تصادم کی فضا ابھرنے لگتی ہیں اور انسانی معاشرہ طرح طرح سے بدامنی اور بدنظمی کا شکار ہونے لگتا ہے۔ اس بنا پر قومی اتحاد کی پہلی بنیاد تو یہی ہو گی کہ انسان حدود الٰہی کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرے اور اپنی خواہشِ نفس اور اپنی مرضی کو ان کے تابع رکھے۔ اُن حدود کو اپنی خواہش کا تابع بنانے کی کوشش نہ کرے بنیادی طور پر یہی ہوس پرستی اور ہوائے نفس ہی ہے جو ہر طرح کی خرابیوں کا سبب بنتی ہے اور حقیقی کامیابی اور فلاح اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب انسان اس سے نجات حاصل کر لے۔ سورۂ حشر آیہ ۹ میں اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے: وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"۔ یعنی صرف ایسے ہی لوگ فلاح پا سکتے ہیں جو اپنے نفس کو حرص و ہوس سے

بچا لیں۔ سورۃ قصص آیہ ۵۰ میں بھی یہی بات ان لفظوں میں فرمائی گئی ہے: "وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ" "اور جو شخص اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش نفس کی پیروی کرے اُس سے زیادہ گمراہ اور کون ہو سکتا ہے"۔

غرض قرآن حکیم نے بار بار ہمیں اس خطرناک راستہ سے ہوشیار کیا ہے کہ ہم اپنی خواہش نفس کی غلامی سے بچے رہیں اور اس کے بجائے صرف اللہ کی مرضی اور حکم کے غلام رہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے بھی اپنی ایک حدیث میں فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: "تین چیزیں انسان کو نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں اسے ہلاک اور تباہ کر دیتی ہیں۔ جو چیزیں نجات کا سبب ہیں وہ یہ ہیں ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرتے رہنا، غصّہ اور سکون دونوں حالتوں میں عدل و انصاف کو اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑنا، دولتمندی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں میانہ روی اور اعتدال کی راہ اختیار کرنا۔ یہ باتیں وہ ہیں جو انسان کو ہر قسم کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھتی ہیں۔ رہیں وہ تین چیزیں جو انسان کی تباہی و بربادی کا سبب ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:

وہ حرص جس کی پیروی کی جائے، وہ خواہشِ نفس جس کی اطاعت کی جائے اور تکبر و غرور۔ اصل میں ان ہی میں تباہ کن باتوں سے نتیجہ کے طور پر خود غرضی کی بدترین صفت کی پیدائش ہوتی ہے جو انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی تباہی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اسی خود غرضی سے انسان دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے احکام خداوندی اور حدود الٰہی کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ خود غرض شخص کی ساری توجہ کا مرکز صرف اس کی اپنی ہی ذات ہوا کرتی ہے جس کے لیئے وہ اپنی خواہش نفس کے تقاضوں پر اندھا دھند عمل کرتا ہے اور پھر نتیجہ میں اجتماعی امن و سلامتی کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں اور پورا معاشرہ بدامنی کی آگ کے شعلوں میں سلگنے لگتا ہے اس بنا پر ہر انسان کے لیئے ضروری ہے کہ وہ اپنے حقوق کے ساتھ دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض کے ساتھ دوسروں کے فرائض کو بھی سمجھے اور ان ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے جو اس پر دوسرے انسانوں کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ ہر آدمی اپنے قومی معاشرہ کے رشتہ میں جڑا ہوا ہے۔ اور

جب تک ہر شخص اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق کا لحاظ نہ رکھے، نہ افراد کی فلاح ممکن ہے اور نہ خود معاشرہ کی۔ بلکہ ایک دوسرے کی زندگی کی بربادی کا سبب بنتا رہے گا اور آخر پورا معاشرہ اور پوری قوم بربادی کے گڑھے میں دفن ہو کر رہ جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ قومی اتحاد کی اصلی تعبیر ہم اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب ہمارے نفس سے خود غرضی کی تمام جڑیں کٹ جائیں، ہم دوسروں کی زندگی کو اپنے ذاتی مفاد کی عینک سے دیکھنا چھوڑ دیں، اپنی خواہشِ نفس کو حکم الٰہی کے تابع رکھیں اور اسی کی روشنی میں آپس کے حقوق و فرائض کا تعین کریں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم یقیناً پوری قوم اور پورے معاشرہ کو اتحاد و اتفاق کے راستہ پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے ورنہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

غرض قومی اتحاد کی تشکیل ان ہی باتوں پر منحصر ہے کہ ہم اپنے اور دوسروں کے مفاد میں عدل و انصاف کی حدوں کی خلاف ورزی نہ کریں، اللہ نے ہر انسان کے لیئے جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کی خلاف ورزی نہ کریں۔

اور اُن سے تجاوز نہ کریں۔ یہاں اس سلسلہ میں شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس وقت ہم اہل پاکستان کو قومی اتحاد کی اُن بنیادوں کو سمجھنے اور ان کو پوری شدت کے ساتھ عملی شکل دینے کی جس قدر ضرورت ہے آئندہ کبھی نہ ہو گی۔

ہمارا ملک ایک عظیم تباہی کے خطرہ سے بچ کر پھر سے ابھرا ہے۔ ہماری اہم ترین مشکلات جو پچیس سال کے طویل عرصہ میں حل نہ ہو سکی تھیں بہت ہی قلیل زمانہ میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکی ہیں، ہمارا آئین نافذ ہو چکا ہے۔ ہمارے قیدی انتہائی باعزت اور باوقار طریقہ پر واپس آ رہے ہیں۔ اب شدید ضرورت ہے اس بات کی کہ ہم سب سر جوڑ کر بیٹھیں اور اختلاف و انتشار کی باتیں کرنا چھوڑ دیں اور ملک کی تعمیر نو کے لیئے سرگرم عمل ہو جائیں

ہمارا باہمی اتحاد ہی ہماری طاقت اور کامیابی کی واحد ضمانت ہے اور یہ اتحاد صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہر فرد دوسرے کے حقوق کا احترام اور اپنے فرائض کی پابندی کرے اور جب

افراد اپنے دلوں میں ذاتی مفاد کو قومی و اجتماعی مفاد پر قربان کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔

عزم و استقلال

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس عزم و استقلال کا ایک نمونہ ہے جسکی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپ نے جس کٹھن ماحول اور انتہائی خوفناک اور پرخطر فضا میں اسلام کی تبلیغ کی اور نوعِ انسان کو احکام خداوندی سے آگاہ فرمایا وہ بس آپ ہی کا کام تھا اس وقت کے عرب قبیلے بت پرستی، ستارہ پرستی، جانور اور درخت کی پرستش میں مبتلا تھے، لوٹ مار، قتل و غارت اور خونریزی انکی زندگی کا بہترین مشغلہ تھا۔ لڑکیاں پیدا ہوتے ہی زمین میں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں، امن و امان اور سکون و اطمینان سے زندگی گزارنا کسی شخص کے لیے کبھی ممکن نہ تھا، ہر طرف جہالت اور ظلم و ستم کا دور دورہ تھا ایسی حالت میں سرورِ کائنات نے تنہا اسلام کی آواز بلند کی اور لاکھوں انسانی درندوں کے مقابلہ میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کا یہ قدم دنیا بھر کے جرائم پیشہ سرکشوں اور حرص و ہوس کے پجاریوں کے خلاف ایک زبردست چیلنج تھا کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ اگر حضورؐ کامیاب ہو گئے تو ان لوگوں کے اقتدار کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے چپہ چپہ پر آپ کے خلاف سازشوں

کا جال بچھا دیا گیا اور آپ کے چراغ حیات کو بجھا دینے کے لیئے
ہر ممکن کوشش عمل میں لائی گئی مگر نبیؐ عربی نے اپنے بے پناہ عزم و
استقلال کی طاقت سے ان کی تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا اس
کے بعد آپ کو ہر طرح کی طمع دی گئی مگر آپ نے سب باتوں کا یہ جواب
دیدیا کہ اگر میرے داہنے ہاتھ پر سورج رکھ دیا جائے اور بائیں ہاتھ پر
چاند، جب بھی میں اپنے راستہ سے نہیں ہٹوں گا۔ آپ تقریباً ۱۳ سال
تک اپنی بعثت کے بعد اپنے محبوب وطن مکہ ہی میں رہے اور لوگوں کو
ہدایت فرماتے رہے جبکہ آپ کے دشمن آپ پر راستہ میں کوڑا پھینکتے
تھے، پتھر مارتے تھے اور جب آپ اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتے تھے
تو آپ کے ساتھ طرح طرح کا توہین آمیز برتاؤ کیا کرتے تھے مگر اُن
میں سے کوئی تکلیف اور کوئی توہین کبھی آپ کے قدم کو متزلزل نہ
کر سکی اور آپ کے عزم محکم واستقلال واستقامت میں فرق نہ پیدا
کر سکی۔ آپ اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم سے فرمایا کرتے تھے کہ
تم سے پہلے جو لوگ اس کرۂ زمین پر حق وصداقت کی آواز بلند کرتے
تھے انھیں آرہ سے چیر ڈالا جاتا تھا اور لوہے کی کنگھیوں سے اُن
کے بدن کی کھال اتار دی جاتی تھی مگر اس کے باوجود وہ اللہ کے دین
پر قائم رہتے تھے۔ اور کبھی باطل کے سامنے سر اطاعت نہیں جھکاتے

تھے۔ تم بھی اُن کے عزم و استقلال اور صبر و تحمل سے سبق لو اور دین حق کی راہ میں ہر مصیبت کو برداشت کرو اور پورے استقلال کے ساتھ جادۂ استقامت پر گامزن رہو۔

یہ کتنے بڑے عزم کی بات تھی کہ رسولؐ اللہ نے تنہا پوری دنیا کے ظالموں اور جابروں کو للکارا اور کسی طاقت و اقتدار کی پروا نہ کی اور یہ کیسے استقلال کی شان تھی کہ آپ کے ضمیر کو کسی طرح مادّی اور دنیوی طمع اور لالچ سے خریدا نہ جا سکا۔ مکّہ کی زندگی میں آپ کے کئی برس شعب ابو طالبؓ کے حصار میں گزرے جہاں آپ اپنے پورے خاندان کے ساتھ فاقہ اور مصیبت کی زندگی گزارتے رہے۔ پہاڑ کے اس مشہور درّہ میں آپ نے کئی سال اسی طرح بسر کیئے۔ آپ کے ساتھ اس گھاٹی میں بڑے سن کے مرد، عورتیں اور چھوٹے بچے بھی تھے۔

ساری قوم نے آپ سے مقاطعہ کیا تھا اور ہر قسم کے اقتصادی نیز زندگی کے تمام تعلقات توڑ دیئے تھے۔ اس کی وجہ سے رسولؐ اللہ اور آپ کے ساتھیوں کو ناقابل بیان آفتوں اور تکلیفوں کا ہر وقت سامنا رہتا تھا۔ موت اپنے پورے بھیانک روپ میں اس چھوٹی سی پاکباز جماعت کے سامنے کھڑی رہتی تھی۔ بھوک اور پیاس کی شدّت سے جب بچے فریاد کرتے تھے تو قریش کے انسانی درندے

اُن کی آوازیں سُن سُن کر قہقہے لگاتے تھے یہ کرب و بے چینی اور بے تنہاہی ایک دو دن نہیں کئی برس تک رہی مگر رسولِ عربی کے پیروں میں جنبش نہ پیدا کر سکی اور آپ کی قیادت میں آپ کے تمام بہادر ساتھیوں نے عزم و استقلال کی ایک عظیم مثال قائم کر دی جس کے سامنے آخر قریش کے اقتدار اور اُس کے غرور کو سر جھکا دینا پڑا اور آمنہ رضؓ کا لال اور عبد اللہ کا یتیم جس کا جسم اطہر پتھروں کے زخموں سے چھلنی تھا اور جس کے لیئے قریش کے کسی گھر میں پناہ کی جگہ نہ تھی اپنے عزم و استقلال کی بدولت زمانہ کی چند ہی کروٹوں میں نسل انسانی کے ذہن و ضمیر پہ حکمرانی کرنے لگا۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عزم و استقلال مایوسیوں کے گہرے سمندروں میں ڈوبی ہوئی دنیا کے لیئے اُمید و نجات کا ساحل ہے اور سسکتی ہوئی اور تڑپتی ہوئی بے جان انسانیت کے لیئے ایک بڑا سہارا ہے۔

خود اعتمادی

خود اعتمادی انسان کی اس اعلیٰ صفت کا نام ہے جس پر اس کی تمام ترقیاں اور ہر قسم کی کامیابی موقوف ہے۔ اگر کسی میں یہ صفت موجود نہ ہو تو وہ کبھی کوئی ترقی حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکتا ہے۔ اپنی طاقتوں پر بھروسا کر کے اُن سے کام لینے اور دوسروں کا سہارا لے کر کام کرنے میں بڑا فرق ہے۔ وہ شخص ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا جو خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے گا۔ اس کے برخلاف جو شخص اپنی قوتوں کو بھول کر دوسروں کی مدد کا منتظر رہے گا اس کو کبھی کامیابی نصیب نہ ہوگی۔

قرآن کریم نے انسان کو خود اعتمادی کی طرح طرح سے تعلیم دی ہے۔ اسے بتایا ہے کہ وہ اپنی ان قوتوں سے کام لے جو اللہ نے اسے عطا کی ہیں۔ خود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سیرت، آپ کے ارشادات اور ان تمام بزرگان انسانیت کا عمل اور کردار جنہوں نے انسان کی برتری کے اس راز کو سمجھ لیا تھا۔ یہ سب چیزیں اس سلسلہ میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ خود اعتمادی کے عظیم ترین جذبہ سے بھری ہوئی ہے۔ قرآن کا اعلان ہے،

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (النجم آیہ ۳۸ تا ۴۰) کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش عنقریب ہی دیکھی جائے گی۔ خود اعتمادی انسان میں قوت عمل اور جذبۂ کارکردگی کو تیز کر دیتی ہے اور اس میں وہ روح زندگی پھونکتی ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی اور جسے کسی دوسری قوت سے مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔ جن افراد یا قوموں نے دوسروں پر تکیہ کیا اور ہمیشہ غیروں کے دروازوں سے مدد کا سہارا لیا وہ ہمیشہ دنیا میں ذلیل بنی رہیں اور دوسروں کی محکوم اور غلام بنائی گئیں۔ زندگی کی بلندیاں انسان کو صرف اسی وقت مل سکتی ہیں جب وہ اپنی عزت اور اپنے مقام کو پہچانے اور اپنی فطری صلاحیتوں سے کام لے۔ ترقی کی راہیں صرف ان ہی بے جگر بہادروں کے لئے کھلتی ہیں جو اپنی ہی طاقت پر اعتماد کرتے ہیں۔ اگر ہر شخص ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہے اور دوسروں کے دروازوں کو تکتا رہے تو ساری دنیا کا کام تمام ہو جائے گا۔ نہ کوئی فرد ترقی کر سکے گا اور نہ کوئی قوم آگے بڑھ سکے گی۔ یہی خود اعتمادی کی صفت تو ہے جو انسان میں جذبۂ عمل بیدار کرتی ہے اور ترقی حاصل کرنے کی امنگوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ قرآن کریم کے اس اعلان سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ

انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور کوئی شخص کسی دوسرے کے بوجھ کو نہیں اٹھاتا۔

حقیقت میں ایسے افراد کو جو خود اپنی صلاحیتوں سے کام نہ لیں اور اُن نعمتوں سے فائدہ حاصل نہ کریں جو اللہ نے ان کو عطا کی ہیں، اس کا کیا حق ہے کہ وہ دوسروں کی کمائی سے فائدہ حاصل کریں اور دوسرے لوگ اُن کی مدد کریں۔ دوسروں کی مدد حاصل کرنے کا استحقاق تو صرف وہی لوگ رکھتے ہیں جو مجبور ہوں، لاچار ہوں اور اس قابل نہ ہوں کہ وہ اپنی آپ مدد کر سکیں اس لیئے یہ بات ضروری ہے کہ جن لوگوں میں صلاحیتیں پائی جاتی ہیں وہ اُن صلاحیتوں سے پورا فائدہ حاصل کریں اور بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کی امدادوں پر بھروسا کریں اور اُن کے دروازوں کی بھیک کے منتظر رہیں خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش اور سعی کریں۔ خود اعتمادی کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان اُن طاقتوں اور صلاحیتوں سے پورا پورا کام لے اور اُن سے وہ فائدہ حاصل کرے جو خدا نے ان میں ودیعت کیا ہے اور اُن سے وہی کام لے جن کے لیئے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ اسلام کے نزدیک یہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے کسی نے ایک شخص کا ذکر کیا کہ وہ دن رات عبادت کیا کرتا ہے۔ آپ نے دریافت کیا کہ جب

وہ ہر وقت عبادت کرتا ہے تو پھر اپنی روزی کا انتظام کہاں سے کرتا ہے۔ جواب میں عرض کیا گیا کہ دوسرے لوگ اس کی امداد کرتے ہیں۔ آپ نے ارشاد کیا کہ جو لوگ اپنی کوشش اور اپنی محنت سے اپنی روزی کماتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کر کے اُن سے کام لیتے ہیں ان کی یہ عبادت اس عابد کی عبادت سے افضل ہے جو خدا کی دی ہوئی قوتوں کو استعمال نہیں کرتا اور ان نعمتوں سے فائدہ حاصل نہیں کرتا جو اللہ نے اس کو بخشی ہیں۔ خود اعتمادی وہ جوہر ہے جس میں ہر طرح کی بلندیاں، کامیابیاں اور قوت عمل کی تمام ترقیاں پوشیدہ ہیں۔ خود اعتمادی جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ کبھی خدا کی نعمتوں سے محروم نہیں رہتے۔ چھوٹے چھوٹے پرندے جب اپنے گھونسلوں سے صبح تڑکے نکلتے ہیں تو ان کو اپنی سعی و کوشش ہی کا ایک سہارا ہوتا ہے اور ساتھ ہی انھیں پورا اعتماد بھی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں کے پھیلے ہوئے دسترخوان سے اپنا حق ضرور ڈھونڈ لائیں گے۔ اور وہ اسی اعتماد کی وجہ سے کبھی اپنے گھونسلوں میں بھوکے واپس نہیں آتے بلکہ اپنے ان بچوں کا رزق بھی ساتھ لاتے ہیں جو ابھی اپنی قوتوں کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہو سکے ہیں اور ان بچوں کو بھی اس کا یقین کامل ہوتا ہے کہ اُن کے ماں باپ اپنی جس خود اعتمادی پر بھروسا کر کے نکلے ہیں اسکی وجہ

سے اپنا رزق تلاش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو کر واپس ہو گئے اور اسی وجہ سے جیسے ہی ان کے ماں باپ آشیانوں میں پہنچتے ہیں تو وہ بچے اپنے چھوٹے چھوٹے مُنہ کھول دیتے ہیں اور ماں باپ سے اپنا حصّہ مانگنے لگتے ہیں اور وہ فوراً ہی ان بچّوں کا حق انھیں دیدیتے ہیں مگر جب بھی ان بچّوں میں خود اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا رزق حاصل کر سکیں تو پھر وہ کسی سے بھی اپنی روزی نہیں مانگتے بلکہ خود اپنی ہی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہیں۔ اس تمام دوڑ دھوپ میں جانوروں کو اس کا یقین ہوتا ہے کہ اُن کی روزی اللہ نے کسی نہ کسی جگہ پر ضرور رکھ دی ہے اور وہ ان کی کوشش سے انھیں ضرور حاصل ہو جائے گی اس کا مطلب صاف ہے کہ خود اعتمادی اس کا نام ہرگز نہیں ہے کہ انسان طاقت و قوت کے اس اصلی سرچشمہ یعنی خدا کو بھول کر صرف اپنی ہی ذات کو یاد رکھے بلکہ اپنی صلاحیتوں سے کام لینا اور خدا کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ رکھنا اور اس کا یقین رکھنا کہ وہی تمام جہان کا حقیقی مالک اور پیدا کرنے والا ہے اور وہی اس سعی اور کوشش کی کامیابی عطا فرمائے گا۔ یہ ہیں خود اعتمادی کے اصلی اور حقیقی معنی۔

بلاشبہ ہم جن قوتوں اور طاقتوں پر بھروسہ کر سکتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ ہماری پیدا کی ہوئی نہیں ہیں۔ اگر خود اعتمادی کا وہ جذبہ جو اسلام کا

بنیادی نظریہ ہے ہر مسلمان میں پیدا ہو جائے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت اُس کو غلام نہیں بنا سکتی اور کبھی وہ کسی دنیوی طاقت کے سامنے نہیں جھک سکتا۔

خود اعتمادی انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی کی پوری ضمانت ہے۔ ہر شخص اپنے کام کو خود ہی انجام دینے کی بھرپور کوشش کرے اور دوسروں کا سہارا تلاش نہ کرے تو دیکھئے سارا معاشرہ چند ہی روز میں کس طرح سدھر جاتا ہے اور کس تیزی کے ساتھ ہر فرد ایک پوری قوم بن کر آسمانِ ترقی پر ستارہ کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ زندگی بنانے میں، زندگی کو ترقی دینے اور زندگی کے تحفظ میں خود اعتمادی ہی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے آدمی حصول مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب کسی ملک کی اجتماعی زندگی کے تحفظ کا سوال درپیش ہوا کرتا ہے۔ اُس وقت بھی دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے سب سے بڑا حربہ اور سب سے مستحکم اسلحہ یہی خود اعتمادی ہے۔ اگر کسی شخص یا قوم میں خود اعتمادی نہ ہو گی تو وہ اپنے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دوسری طاقتوں پر تکیہ کرنے والی قومیں اُن کی امداد کا انتظار ہی کرتی رہیں گی اور اتنی دیر میں دشمن اُن کو نیست و نابود کر کے رکھ دیگا۔ ضرورت سب سے بڑی ایک سچے مسلمان کے لئے اس کی ہے کہ وہ

اس اہم ترین بنیادی تعلیم کو سمجھنے کی پوری طرح کوشش کرے اور اس پر عمل کرے جس کا نام ہے خود اعتمادی ورنہ زندگی کا ہر داخلی اور خارجی دشمن اس کو فنا کر دے گا اور وہ کبھی اپنا بچاؤ نہ کر سکے گا۔ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں کامیابی اور ترقی کا اگر کوئی موثر ذریعہ اور وسیلہ ہو سکتا ہے تو وہ یہی خود اعتمادی ہے۔ اسی سے معاشرہ کی تنظیم کا کام بھی سب سے زیادہ لیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ جبکہ احساسِ فرض کو سمجھنے اور اسے عمل میں لانے کا نام ہوا تو پھر اس سے زیادہ قومی تنظیم کا اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو اللہ اور اس کے پاک رسول ؐ نے اس کی تعلیم دی ہے تاکہ ہر شخص اللہ کی عطا کی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں پر بھروسا رکھے اور کوشش پیہم میں مشغول ہو جائے اسی خود اعتمادی کا دوسرا نام ثابت قدمی بھی ہے کیونکہ جب تک کسی قوم میں خود اعتمادی نہ ہوگی وہ کسی دشمن کے مقابلہ میں یا کسی مصیبت کے سامنے کبھی نہیں ٹھہر سکتا۔ اسی خود اعتمادی نے مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کو کرۂ زمین کے تمام حصوں میں پھیلا دیا یہی وہ کامیاب صفت ہے جس نے مکہ اور مدینہ کے تھوڑے سے مسلمانوں کی جماعت کو جو مادی حیثیت سے بے یار و مددگار تھے، چند ہی دنوں میں اس قابل بنا دیا کہ قیصر و کسریٰ کے تاج ان کے قدموں میں لوٹنے

لگے۔ یہی خود اعتمادی کی بے پناہ روح تھی جو پیغمبرؐ مدنی نے ہر مسلمان کے ضمیر میں اور دل کی گہرائیوں میں اتار دی تھی جس نے انھیں صبر و استقامت، قوت عمل اور یقین محکم کی چٹانوں میں تبدیل کر دیا تھا اور ہر مسلمان جذبۂ خود اعتمادی سے اس طرح سرشار تھا جس کی مثال دنیا کی کسی دوسری قوم میں نہیں مل سکتی۔ اسلام کی پہلی سب سے بڑی جنگ بدر کبری میں صرف تین سو تیرہ ۳۱۳ نہتے مجاہد تھے جن کے پاس نہ اسلحہ تھا، نہ خوراک کا ذخیرہ تھا اور نہ حمل و نقل کے سامان تھے مگر کس طرح وہ اس زبردست فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل آئے تھے جو ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ تھی اور جس کی تعداد بعض روایات کی بنا پر تین ہزار تھی۔ مسلمانوں کے پاس قلتِ تعداد کے ساتھ ساتھ سامانِ جنگ بھی موجود نہ تھا مگر جس مستحکم ترین اسلحہ سے وہ مسلح تھے وہ ان کی خود اعتمادی ہی تھی اور ان کا یہ عزم تھا کہ ہم کافروں سے اُن کے ہتھیار چھین چھین کر جنگ کریں گے۔ بدر کی اس آزمائشی پہلی اسلام و کفر کی لڑائی میں جب مکّہ سے مشرکوں کا ٹڈی دل لشکر مسلمانوں پر حملہ کرنے کی غرض سے چلا تھا تو اس لشکر کے کمانڈر ابوجہل نے قسم کھائی تھی کہ جب تک میں بدر کے میدان میں پہنچ کر ایک ایک مسلمان کی لاش نہ دیکھ لوں گا اور محمدؐ کے ساتھیوں کا صفایا نہ کر ڈالوں گا اس وقت تک شراب

نہیں پیوں گا مگر ابوجہل کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی اور شراب کے جام کے بدلے اُسے جامِ موت پینا پڑا۔ آج پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دھرایا ہے۔ آج کے ابوجہل نے بھی اس کا عہد کیا تھا کہ جب تک اس کی فوج مملکت اسلامیہ میں کامیابی کے ساتھ داخل نہ ہوگی اس وقت تک میں شراب کو ہاتھ نہ لگاؤ نگا مگر مسلمان مجاہدوں کی خوداعتمادی نے مشرکوں کی فوج کے ناپاک ابوجہل کے خواب کو خواب پریشاں بنا کر رکھ دیا اور جس طرح بدر کے ننھے مسلمانوں نے مشرکین مکہ کے عظیم لشکر کو لاشوں میں تبدیل کر دیا تھا اور اُن ہی کا اسلحہ چھین کر انھیں تاریخ کی نہ بھولنے والی شکست فاش دی تھی، آج پھر ہمارے ننھے جگر ننھے مجاہدوں نے مکّارہ اور عیّارہ دشمن سپاہ کو جو چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح ہماری پاک سرزمین میں گھسنا چاہتی تھی ایسی عبرت ناک شکست دی جو تاریخ عالم کا جزو بن چکی ہے جس کے سیاہ داغ کو کبھی دھویا نہیں جا سکیگا۔ ان ننھے مجاہدوں نے اللہ اکبر اور یا علی حیدرؓ کے ایک ہی نعرے میں بزدلی ظالم اور دشمنِ انسانیت کافر فوج کے چھکے چھڑا دیئے اور مسلمانوں کی خوداعتمادی کی مضبوط چٹانوں سے ٹکرا کر دشمن کے دیوہیکل ٹینک اور سارے بم اور آلاتِ حرب وضرب پاش پاش ہو کر رہ گئے۔ ہمارے سامنے فرزند آمنہ

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خود اعتمادی کا نمونہ ہے۔ ہمارے سامنے فاتحِ بدر و خیبر، شہسوارِ اُحد و حُنین و خندق، شاہِ لافتیٰ امیر المومنین حضرت حیدرِ کرار کی خود اعتمادی کا نقشہ ہے جنکی ایک ضرب جو عمرو کے سر پر پڑی تھی حسبِ ارشادِ سرورِ کائنات قیامت تک جن و انس کی عبادت سے افضل ہے۔ ہمارے سامنے نواسۂ رسولؐ اللہ حضرت امام حسینؑ کی خود اعتمادی کی تصویر ہے جنہوں نے شبِ عاشور شمع بجھا کر اپنے تمام ساتھیوں سے ارشاد فرمایا تھا کہ تم سے میں اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں۔ دشمن صرف میرے ہی خون کا پیاسا ہے اور میں تنہا اس سے جنگ کر لوں گا مگر امامؑ عالی مقام کے وفادار اور خود اعتمادی سے سرشار ساتھیوں نے آپ کے قدم چوم کر درخواست کی کہ ہمیں شہادت کی نعمت سے محروم نہ کیجئے۔ آج بھی پاکستان کی مسلمان قوم خود اعتمادی کے جذبہ سے سرشار ہے اور جس قدر اس جذبہ میں ترقی ہوتی جائے گی دنیا کی کوئی طاقت اُن کے سر کو اپنے سامنے جھکانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور انھیں تسخیر نہ کر سکے گی۔

مظاہر قدرت سے عبرت

قرآن پاک نے بڑی شدّت کے ساتھ اور بار بار انسان کو مظاہر قدرت میں غور و فکر کی طرف دعوت دی ہے۔ کبھی آسمانوں کی پیدائش کا ذکر کر کے۔ کبھی ستاروں کے نظم و ترتیب اور اُن کے طلوع و غروب کے نظام کی باریکیوں کو یاد دلا کر۔ کبھی زمین اور اُس کے اندر پھیلی ہوئی نعمتوں کا تذکرہ کر کے، کبھی سمندروں، آبشاروں، سبزہ زاروں اور پہاڑوں کا حوالہ دے کر، کبھی بادلوں اور گرج اور بجلی کے مناظر بیان کر کے، کبھی پرندوں اور چوپایوں کی پیدائش اور ان کے طرزِ زندگی کی تشریح کے ساتھ اور کبھی فصلوں کے تغیّر اور پھلوں پھولوں کے قدرتی اور حسین و دلکش نظاروں کی نقشہ کشی کر کے۔

یہ سب کچھ اس غرض سے کیا گیا کہ وہ انسان جو

بغیر ان ظاہری سہاروں اور وسیلوں کے کائنات کی پیدائش کے راز کو نہیں سمجھ سکتا تھا، کم از کم ان ہی وسائل اور ذرائع اور ان مظاہر قدرت کی مدد سے اس راز سے آگاہی حاصل کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن حکیم کی یہ مسلسل کوشش ہے کہ انسان کی فکر و نظر کا آخری اور انتہائی مقصد صرف مظاہر قدرت ہی نہ ہوں اور وہ محض ان ہی میں الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ ان کی سطح سے اونچا ہو کر وہ اُس حقیقت کو بھی سمجھ لے جو اِن کے پردہ میں چھپی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جان لے کہ خود اُس کا رشتہ اس پوری کائنات سے کیا ہے اور اس کائناتی معاشرے میں اسے کیا مقام حاصل ہے۔ اس طرح یہ قدرتی مظاہر ایک ایسا وسیلہ ثابت ہوں گے جن سے انسانی شعور کو اثر اور موثر اور خالق و مخلوق کے باہمی ربط اور رشتہ سے آگاہی حاصل ہو گی اور یہ بات بھی کھل جائے گی کہ اس پورے جہان کے پیدا کرنے والے قادر مطلق اللہ کی بارگاہ کے سامنے اس کی تمام مخلوق سے بہتر فرد

یعنی انسان کی ذمہ داریاں کیا ہو سکتی ہیں اور وہ انہیں کس طرح پورا کر سکتا ہے۔

مظاہر قدرت سے متعلق بحث کے اس رخ پہ غور کرنے کے لیئے ہمیں قرآن پاک کے چند حوالے پیش نظر رکھنے سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ مثال کے طور پہ ہم سورۂ بقرہ کی اس آیت پر نظر کریں جس میں اللہ فرماتا ہے: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (آیت/۱۶۴) بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے آنے جانے اور کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزیں لیکر سمندر میں چلتی رہتی ہیں اور پانی میں جو اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیئے اور ہواؤں کے چلانے میں

اور ابر میں جو آسمان وزمین کے درمیان مسخّر ہے (ان تمام چیزوں میں) ان لوگوں کے لیئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔

یا سورۃ آل عمران یہ آیتیں (۱۹۰/۱۹۱) جنکا ترجمہ یہ ہے:۔ بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے آنے جانے میں عقل والوں کے لیئے بڑی نشانیاں موجود ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمان وزمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تو نے یہ سب کچھ بیکار نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے۔ پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ فرما۔"

اسی طرح سورۃ المؤمنون آیۃ ۱۲/۱۴ میں ارشاد ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:۔ اور یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے اسے نطفہ کی شکل عطا کی اور اور ایک محفوظ جگہ میں رکھا پھر ہم نے اسے جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا بنا دیا اس کے بعد اس کو گوشت

کا ایک ٹکڑا بنایا پھر ہم نے ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں پر گوشت کو لپیٹ دیا۔ "ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ" پھر ہم نے اس کو ایک دوسری ہی مخلوق بنا دیا۔ اس سے کچھ آگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے (ترجمہ) اور یقیناً ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے۔ اور ہم اپنی مخلوق سے بے خبر نہیں ہیں اور ہم نے آسمان سے ایک اندازہ کے مطابق پانی برسایا پھر ہم نے اسے زمین میں ٹھہرایا اور یقیناً ہم اس کو ہٹا دینے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے اس پانی کے ذریعہ سے تمہارے لیئے کھجور اور انگور کے باغ اگا دیئے۔ ان میں تمہارے لیئے بہت سے میوے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے ہو۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے :- اور بیشک تمہارے لیئے چوپایوں میں عبرت حاصل کرنے کا موقع ہے۔ جو چیز ان کے پیٹ میں ہے (یعنی دودھ) وہ ہم تمہیں پینے کے لیئے دیتے ہیں اور تمہارے لیئے اُن میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور تم اُن میں سے (بعض کو) کھاتے بھی ہو اور تم ان چارپایوں پر اور کشتیوں پر سوار ہو کر پھر سفر بھی کرتے ہو۔

سورۂ نور آیہ ۴۳ تا ۴۵ میں مظاہر قدرت کی نشاندہی اس طرح کی گئی ہے (ترجمہ) کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہی بادل کو چلاتا ہے پھر انہیں آپس میں ملا دیتا ہے اس کے بعد اسے تہ بتہ کر دیتا ہے اور تم دیکھتے ہو کہ ان کے بیچ سے بارش نکل کر آتی ہے پھر اُن ہی کے پہاڑ جیسے ٹکڑوں سے اولے برساتا ہے، انہیں جس پر چاہتا ہے گرا دیتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے انھیں پھیر دیتا ہے۔ قریب ہے کہ اُس کی بجلی کی چمک آنکھوں کی بینائی کو لیجائے۔ اللہ ہی رات اور دن کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ "اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ"۔ یقیناً ان تمام باتوں میں آنکھوں والوں کے لیے بڑا سبق ہے۔ پھر ارشاد ہوا ہے: اور اللہ ہی نے ہر چلنے والے جاندار کو پانی سے پیدا کیا تو اُن میں سے کچھ وہ ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلا کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو چار پیروں پر چلتے ہیں۔ اللہ جو چیز چاہتا ہے پیدا کرتا ہے بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ان آیات کریمہ اور اس قسم کی تمام آیتوں میں

مظاہر قدرت کی تفصیل اسی لیئے کی گئی ہے کہ انسان ان پر غور کرکے اس نتیجہ پر آسانی سے پہنچ جائے کہ یہ چیزیں کسی طرح بھی خود بخود نہیں پیدا ہوگئیں بلکہ اِنھیں کسی عظیم ترین ہستی نے خلق کیا ہے جو اپنے کمال قدرت اور اپنی ذات وصفات میں نہ تو مثل رکھتی ہے اور نہ اس کا کوئی شریک ہی ہوسکتا ہے۔ اور جس طرح اُسی نے انھیں پیدا کیا ہے اسی طرح اس پورے کائناتی نظام کو برقرار رکھنا بھی اسی کا کام ہے۔ دنیا کی جاہل قوموں نے، ان چیزوں کی حیرت انگیزی سے محو ہوکر انہیں معبود کا درجہ دیدیا اور خود ان ہی کی پرستش کرنے لگیں اور اُن کی فکر و نظر کی پرواز ان مجازی پردوں کے آگے نہ جاسکی اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ درخت کی کوئی پتّی اور خاک کا کوئی ذرّہ بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا جب تک اسے کوئی جنبش اور حرکت دینے والا نہ ہو تو پھر زمین و آسمان کا یہ حیرت انگیز نظام بغیر کسی قادر مطلق اور واحد و یکتا ذات کے ارادہ و مشیت کے کس طرح موجود ہوسکتا ہے اور کس طرح قائم اور برقرار رہ سکتا ہے۔ انسان اگر اپنی عقل سے صحیح طریقہ پر ذرا بھی کام لے

تو اس کے لئے یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ زمین اور دوسرے سیاروں اور لاتعداد ستاروں کو کونسی قوت سنبھالے ہوئے ہے اور ان کے درمیان کس نے ایک مخصوص کشش، جذب اور فاصلوں کا نظام قائم کر دیا جس سے ان میں سے کوئی الگ نہیں ہو سکتا۔ ان کے طلوع و غروب میں باقاعدگی اور ان میں گرمی اور سردی کے مناسب قانون کس نے بنائے ہیں اور یہ کون قدرت والا ہے جس کی حکمت کاملہ نے غضبناک اور انتہائی پر خطر سمندروں کو ایک مشتِ خاک انسان کی گرفت میں دے دیا ہے کہ وہ انہیں جس طرح چاہے استعمال کرے اور ان پر حکومت کرنے لگے اور پھر یہ غضبناک سمندر اپنی بلاخیز اور طوفانی موجوں کے باوجود چھوٹے چھوٹے جزیروں کی حدوں میں کبھی داخل نہ ہو سکیں اور جب تک ان کے حقیقی حکمران کی اجازت نہ ہو اپنی بندشوں کو توڑنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ سمندری بخارات کے لئے بادلوں کی صورت میں جمع کر بارش لانے کا نظام کس نے بنایا۔ آگ، پانی، مٹی اور ہوا کے مخصوص مزاج کس نے معین کر دیئے اور ان میں اعتدال اور بے اعتدالی کے حدود کس نے مقرر کیئے۔ غرض انسانی فکر سے جس حد تک کام لیا جائے گا، اسے

سامنے تخلیق کے راز کھلتے چلے جائیں گے اور وہ اس حقیقت کا انکار نہ کر سکے گی کہ یہ پوری کائنات ایک ایسی قادرِ مطلق ہستی کی پیدا کی ہوئی ہے جو اپنی ذات و صفات میں واحد و لاشریک ہے اور اسی کے حکم اور اسی کی ہدایت پر عمل کرنے میں انسان اور اس کائنات کی ہر چیز کی فلاح و نجات مضمر ہے۔

اسلام کا تصوّرِ انسان

اِسلام نے دنیا کو انسان کا جو تصوّر عطا کیا ہے وہ سورۂ بقرہ آیہ ۳۰ میں اللہ کے اس اعلان سے پوری طرح ظاہر ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: "وہ وقت یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں" اس کا مطلب یہی ہوا کہ زمین میں اللہ کی نیابت کی حقدار پوری کائنات میں صرف وہی مخلوق قرار پائی جو صحیح معنی میں انسان کہی جاسکتی ہے اور اس طرح انسان کو تمام مخلوقات پر برتری عطا فرمائی گئی۔ فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ انسانِ کامل یعنی آدم علیہ السلام کے سامنے اللہ کے سجدہ کے لیئے جھک جائیں۔ یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ انسانِ کامل کا مرتبہ فرشتوں سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ دنیا انسان کے اصلی مقام اور مرتبہ سے بے خبر تھی

اشرف کائنات، انسان کی پیشانی بے جان پتھروں اور حقیر جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کے آگے جھکی ہوئی تھی۔ اسے خبر نہ تھی کہ اللہ نے یہ تمام کائنات خود اسی کی خدمت کے لیئے بنائی ہے ؏

نہ تو زمیں کیلئے ہے نہ آسماں کے لیئے
جہاں ہے تیرے لیئے تو نہیں جہاں کیلئے

اسلام ہی نے اسے اس غفلت سے ہوشیار کیا اور جہالت کی اس نیند سے جگایا اور اُسے اُس کے اصلی مقام اور مرتبہ سے آگاہی بخشی قرآن کے ان لفظوں میں: وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (بنی اسرائیل ۷۰) اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت عطا کی ہے اور ہم ہی نے اسے خشکی اور دریا میں حمل و نقل کی سہولتیں دی ہیں اور ہم ہی نے اس کو نفیس چیزوں کا رزق عطا کیا اور ہم ہی نے اسے اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے

اللہ کے اس فرمان سے اس بات کا صاف طور سے

پتہ چلتا ہے کہ کائنات کے معاشرہ میں انسان کو کس قدر بلندی اور برتری اور کتنی فضیلت اور فوقیت حاصل ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں۔ اس کے سامنے ہی قرآن حکیم میں زمین و آسمان کی بہت سی خاص چیزوں کا نام لیکر بتایا گیا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو انسان ہی کی خدمت کے لیئے پیدا کیا ہے اور اس کے لیے انھیں مسخّر یعنی تابع بنا دیا ہے۔ جیسے سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے، دریا، کشتیاں پھر یہ بھی فرمادیا کہ جو کچھ بھی زمین میں پایا جاتا ہے وہ سب کا سب انسان کے لیئے مسخّر کردیا گیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر سورۂ لقمان آیہ/۲۰ میں یہاں تک بتا دیا گیا: اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّ بَاطِنَۃً - کیا تم لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمہارے ہی کام میں لگا رکھا ہے اُن سب چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی تمام نعمتیں پوری کردی ہیں۔

کوئی اور نہیں یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے دنیا کو انسان کے صحیح تصوّر، اصلی مرتبہ اور حقیقی مقام و منزل سے آگاہ کیا اور اُس میں یہ حوصلہ اور جرأت پیدا کی کہ وہ کائنات کی بڑی اور چھوٹی چیزوں کو سجدہ کرنے کے بجائے اُن پر حکومت کرے اور اُن سے اپنے جائز ضروریات کو پورا کرے اور ساتھ ہی اُن کی پیدائش کے چھپے ہوئے بھید معلوم کرے۔ وہ زمین کے جگر کو چیر ڈالے، پہاڑوں کی چٹانوں کو پھاڑ ڈالے، فضاؤں کے چپّہ چپّہ پر پرواز کرے، سمندروں کی تہ میں اتر جائے اور سیاروں پر پہنچ کر اُن کے اندر اللہ کی نشانیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ غرض انسان کائنات کی کسی چیز کی غلامی کے لئے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ اس کی پیدائش میں بلندی، برتری اور سرداری رکھی گئی ہے۔ اُس کو زمین و آسمان کی وسعتوں پر بھرپور اقتدار ملا ہے، اُسے قوت و طاقت کے نہ ختم ہونے والے خزانے عطا کیے گئے ہیں اور اللہ کی طرف سے اُس کو رزق کے ایسے ذخیرے دیئے گئے ہیں جن میں اُس کی زندگی کی بقا اور خوشحالی کے راز چھپے ہوئے ہیں۔ یہ رزق

صرف وہی نہیں ہے جسے کھا لیا جائے بلکہ اس سے مراد ہر وہ ضرورت ہے جس پر انسان کی ترقی اور زندگی موقوف ہے۔ یہ وہ رزق ہے جو اس "طائر لاہوتی" کی پرواز کو کوتاہ نہیں بناتا بلکہ اس کے لیئے کائنات کی وسعتوں کو مسخر کردیتا ہے۔ کائنات کی ساری بلندیاں انسان کو اسی رزق سے ملتی ہیں جو اللہ نے اس کے لیئے مقرر کیا ہے، جسے چھوڑنا موت ہے اور جس کا حاصل کرلینا ابدی زندگی ہے ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اللہ نے انسان ہی کی پیدائش پر قرآن حکیم میں اپنے بہترین خالق ہونے کا ان لفظوں میں ذکر فرمایا ہے: فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (المؤمنون ۲۳/۱۴) اللہ کی ذات بڑی برکت والی ہے جو تمام خلق کرنے والوں سے بہتر ہے۔ پھر سورۂ والتّین میں انسان کامل ہی کی پیدائش کو "احسنِ تقویم" یعنی بہترین انداز کی پیدائش کا خطاب عطا ہوا۔ اس طرح اسلام نے انسانِ کامل کا جو تصوّر دیا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کے

پورے معاشرے میں اُس سے بہتر کوئی نہیں ہے، وہ کائنات کا خادم نہیں بلکہ کائنات خود اس کی خدمت گزار ہے، وہ اُس کا حاکم ہے، اس کا سردار ہے اور زمین میں اللہ کا نائب ہے، لیکن اسی کے ساتھ اسلام نے یہ بھی بتادیا ہے کہ انسان کو اُس کا اصلی مقام صرف اُسی وقت مل سکتا ہے جب وہ اللہ کے دیئے ہوئے وسیلوں اور قوتوں کو صحیح طریقہ پر استعمال بھی کرے اور اپنے مقام اور مرتبہ کو حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے۔ اُس کے پاس وسیلے ہیں، قوت و طاقت ہے تو اُس کے گرد مشکلات کا ایک زبردست طوفان بھی ہے۔ مگر صحیح معنی میں انسان وہی ہے جو مشکلات کو کچل کر اپنی منزل کا راستہ تلاش کرلے اور اُن میں سے کوئی چیز بھی اس کے لیئے رکاوٹ نہ بن سکے۔ سورۃ البلد آیہ ۴ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ فرماکر: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ " ہم نے انسان کو بڑی مشقت کے لیئے پیدا کیا ہے اور ساتھ ہی سورۃ النجم آیہ ۳۹ میں یہ بھی فرما دیا گیا: وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی " انسان کو صرف وہی ملے گا جس کی وہ سعی و کوشش کرے گا۔ غرض اسلام

نے انسان کی عظمت و بلندی بتانے کے ساتھ ہی یہ بات بھی بتادی ہے کہ اُسے یہ بلندی صرف اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ سعی و کوشش کرے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہ رہے بلکہ اُن طاقتوں اور صلاحیتوں اور وسیلوں کو کام میں لائے جو اللہ نے اُسے عطا کیے ہیں۔

اسلام کی اصطلاح میں حقیقی انسان اصلی مومن ہوتا ہے اور حقیقی مومن انسان ہوتا ہے۔ اصلی مومن یا حقیقی انسان کبھی سعی سے غفلت نہیں کرتا اور کبھی اس کو مصائب و مشکلات کے طوفان مایوس نہیں بناتے۔ وہ اپنے عمل سے اپنی تقدیر بناتا ہے اور اپنی سعی و کوشش سے اپنی قسمت سنوارتا ہے وہ عزم و استقلال کا مجسّمہ ہوا کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کرام سے فرمایا کرتے تھے "تم سے پہلے جو لوگ گذر گئے ہیں انھیں آرہ سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، اُن کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جس کی وجہ سے اُن کی کھال ان کے گوشت سے الگ ہو جاتی تھی مگر یہ کڑی آزمائشیں بھی انھیں دینِ حق سے جدا نہ کر سکیں"۔

یہی صبر یہی عزم و استقلال اور یہی سعی و عمل دوسرے لفظوں میں ایمان ہے جس کے بغیر بلندی نہیں مل سکتی اور اسی کی طرف قرآن حکیم نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ آل عمران آیہ/۱۳۹ اگر تم میں سچا ایمان ہے تو تم ہی سب سے بلند اور سب پر غالب رہو گے۔

سرور کائنات کے ایک صحابی کے فرزند کا انتقال ہو گیا تھا اس کے غم میں انھوں نے اپنا سارا کاروبار ترک کر دیا اور اپنے گھر کے ایک حصّہ میں دن رات عبادت کرنے لگے۔ حضورؐ انور کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى لَمْ يَكْتُبْ عَلَيْنَا الرَّهْبَانِيَّةَ اِنَّمَا رَهْبَانِيَّةُ اُمَّتِي الْجِهَادُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اللہ نے ہمیں دنیا کو بالکل چھوڑ دینے کا حکم نہیں دیا ہے۔ بلکہ میری امت کے لیئے رہبانیت یعنی ترک دنیا اللہ کی راہ میں زبردست کوشش وسعی کا نام ہے۔ مطلب یہی ہوا کہ اسلام کے نزدیک انسان کو اس کا صحیح مقام اور مرتبہ صرف اسی وقت مل سکتا ہے جب وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرے۔

برکت و رحمت کی مبارک رات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ﴿۲﴾ لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ۬ۙ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَہۡرٍ ﴿۳﴾

(سورۃ قدر) بے شک ہم نے اس قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے اور اے سننے والو تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے۔ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے" رمضان کے اس عظیم و با برکت مہینہ کی بہت سی خصوصیتوں میں سے دو ایسی بنیادی خصوصیتیں ہیں جو لیل و نہار کی گردش کے کسی حصّہ کو حاصل نہیں۔ ایک یہ کہ روزوں کے ذریعہ سے اس ماہِ مبارک میں تزکیۂ نفس اور تطہیر روح کا وہ نظام مقرر کیا گیا ہے جو ایمان و طاعتِ خداوندی کی سب سے بڑی بنیاد ہے اور اس ماہ کے شب و روز اخلاص و عبدیت کا وہ تصور پیش کرتے ہیں جو کسی اور مہینہ میں ممکن نہیں۔ دوسری بنیادی اور اہم ترین خصوصیت یہ ہے

کہ اِس میں قرآنِ حکیم کا نزول ہوا اور یہ نزول اس مبارک شب میں ہوا جسے "لیلۃُ القدر" کے مقدس نام سے پکارا جاتا ہے۔ شبِ قدر کی تعیین میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر اتنی بات ضرور طے شدہ معلوم ہوتی کہ یہ بابرکت شب رمضان ہی کے مہینہ میں ہے۔ کیونکہ سورۂ بقرہ آیہ/۱۸۵ میں اللہ نے اسے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ نزول قرآن ماہِ رمضان ہی میں ہوا تھا۔ ان لفظوں کے ساتھ: شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ" رمضان ہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا"۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ شبِ قدر اسی ماہِ مبارک میں ہے۔ اب اس کے بعد زیادہ تر روایات سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ مبارک شب رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے۔ مگر اکثر روایات میں تیئیسویں ۲۳ اور ستائیسویں ۲۷ شب کے متعلق خصوصیت کے ساتھ زیادہ تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس عدم اظہار اور اس اخفا کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ ایمان

اس شب کی تلاش میں کئی راتوں میں عبادت کریں اور انھیں اس طرح بہت ثواب حاصل ہو۔ غرض ستائیسویں رمضان کے متعلق سب کا زیادہ رجحان ہے کہ یہی شب قدر ہے۔ شبِ قدر کی فضیلت کے لیئے اللہ کا یہ اعلان کافی ہے کہ وہ ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے (جن میں کوئی شبِ قدر نہ ہو) یہ مبارک رات قیامت تک ہر سال آتی رہے گی۔ یہی وہ شب ہے جس کی تاریکی کے پردہ میں الٰہی نور کی وہ شعاع ہمیں مل گئی جس نے ہمیں ایک ایسے نظام زندگی سے روشناس کرایا۔ جو نوع بشر کی فلاح کے لیئے اب آخری اور دائمی ضمانت ہے یعنی "قرآن حکیم" نزول قرآن اسی شب میں (حضرتِ ابن عباسؓ کی حدیث کے مطابق) لوحِ محفوظ سے آسمانِ اوّل کی طرف ہوا تھا اور پھر رفتہ رفتہ تقریباً "بائیس ۲۲ سال میں تنزیل لفظی کی صورت میں حضرت روح الامین کے توسط سے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترتا رہا۔ ہمیں چاہیئے کہ جسقدر بھی ممکن ہو ہم شبِ قدر میں عبادت کرنے کی سعی و کوشش کریں اور اس کوشش سے بھی بہت زیادہ

خود قرآن کریم کو پڑھنے اور سمجھنے اور اس کی ہدایتوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں جس کے نزول کی وجہ سے شب قدر شب قدر بن گئی۔ یقیناً یہ بات کتنی افسوس ناک ہوگی! اگر ہم اس شب کی تو بے حد عزت کریں مگر قرآنی ہدایات پر عمل کرنے میں کوتاہی سے کام لیں۔ اور بلاشبہ ہم اہل پاکستان کے لئے اب اس ستائیسویں تاریخ کے ساتھ ایک اور بھی خاص ربط پیدا ہو گیا ہے اور وہ یہ کہ اسی تاریخ اللہ نے ہمیں یہ عظیم اسلامی مملکت بھی عطا فرمائی اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس عطیۂ الٰہی پر شکر بھی ادا کرتے رہیں اور شکر کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم قرآنی ہدایات پر بھرپور عمل کریں اور پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ، بلندی اور استحکام کے لئے مل جل کر سعیِ بلیغ کریں اور آپس کے تمام اختلافات کو مٹا دیں۔

عقیدۂ توحید کا اثر انسانی معاشرہ پر

عقیدۂ توحید سے مراد ہے خدا کو ایک ماننا یعنی یہ کہ اس پوری کائنات کا پیدا کرنے والا، رزق دینے والا زندگی اور موت دینے والا، اس میں نظم و ترتیب قائم کرنے والا، اس کی تربیت اور پرورش کرنے والا صرف ایک خدا ہے جو ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے کامل ہے۔ نقص اور عیب کا اس کی ذاتِ اقدس و اعلیٰ سے کوئی ربط و تعلق ممکن نہیں۔ وہی طاقت و قوت کا سرچشمہ ہے اور وہی علم اور عظمت و بزرگی کا مرکز ہے، وہی حیّ و قیّوم ہے، وہی قدیم و علیم ہے، وہی غنی و رحیم ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کی طرف احتیاج نہیں رکھتا، وہ ہر چیز کی حقیقت و اصلیّت کو جانتا ہے ــــ وہ ذرہ ذرہ اور پتّی پتّی کا حال جانتا ہے۔ وہ دلوں کی گہرائی اور فکر و نظر کی ہر پہنائی سے باخبر ہے، وہ غیبت و شہادت اور ظاہر و

باطن میں سے ہر چیز سے واقفیت رکھتا ہے، وہ علّام الغیوب ہے یعنی جو جو چیزیں اس کی مخلوق سے پوشیدہ ہیں وہ ان سب کو پوری طرح جانتا ہے کیونکہ اس کی ذات کے لیئے تو کوئی غیب ہی نہیں، ہر شی اس کے سامنے ظاہر و آشکارہ ہے۔ غرض عقیدۂ توحید سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی ذات کو ہر حیثیت سے واحد و یکتا تسلیم کیا جائے اور ہر اعتبار سے اس کو کامل اور ہر عیب و نقص سے پاک مانا جائے۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن ایک ایسی عظیم ترین ذات کے وجود کو تسلیم کرلے گا جو خود انسان اور کائنات کی دوسری تمام چیزوں کی پیدا کرنے والی، اور بخشنے والی، زندگی اور موت دینے والی طاقت و قوت بخشنے والی اور ساتھ ہی ہر مخلوق کی ظاہری اور پوشیدہ تمام باتوں کا علم رکھنے والی، اچھی باتوں اور بری چیزوں کا فرق بتانے والی اور پھر بری باتوں پر سزا اور اچھی باتوں پر انعام و جزا کا وہ آخری فیصلہ کرنے والی ہے جسے کوئی دوسرا کبھی بدل ہی نہیں سکتا۔ اسطرح عقیدۂ توحید فکر انسانی کے لیئے ایسی راہیں کھولتا ہے

جن کی مدد سے وہ اچھائی اور برائی کے فرق کو محسوس کرنے لگتی ہے اور اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ جتنی بھی اچھائیاں اور خوبیاں ممکن ہوسکتی ہیں اُن سب کا کامل ترین مرکز صرف اللہ ہے جو کبھی برائی اور بدی کو پسند نہیں کرسکتا اس لئے کہ وہ خود ہر برائی، عیب و نقص اور بدی سے پاک ہے، اور اس کے مقابلہ میں وہ ہر اچھائی کو پسند کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ خود ہر اچھائی، نیکی، خوبی اور کمال کا مرکز ہے۔ اس عقیدہ کے سامنے آتے ہی پھر اس بات کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہو جائے گا کہ ایسی کامل اور عظیم ذات کبھی کوئی کام بے مقصد اور فضول نہیں کرسکتی اس لئے کہ اُس نے کائنات کی ہر چیز کو کسی نہ کسی مقصد اور کسی نہ کسی سبب سے بنایا ہے اور جب ہر مخلوق کی پیدائش کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے تو یہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا کہ انسانی پیدائش کا کوئی مقصد نہ ہو یعنی اس پوری کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا مقصد ہے۔ قطرہ قطرہ کی پیدائش کی غرض اور سبب موجود ہے تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسانی پیدائش بیکار اور بے مقصد ہو، یقیناً اُس کامل و یکتا خالق کائنات نے

انسان کی خلقت و پیدائش میں بھی کوئی حکمت، کوئی غرض اور کوئی مقصد ضرور رکھا ہوگا اور اس کی بقا اور زندگی کے لیئے بھی کوئی نظام اور کوئی طریقہ ضرور مقرر کیا ہوگا جو اس کے نزدیک بہترین طریقہ اور بہترین نظام زندگی ہوگا اور یقیناً وہ طریقہ اور نظام زندگی ایسا ہوگا جو انسان کی زندگی کے ہر رُخ پر چھایا ہوا ہو اور اس کا کوئی ایک معمولی اور چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی اس نظام کی ہمہ گیری اور وسعت سے بچا ہوا نہ رہ جائے کیونکہ عقیدۂ توحید کی بنا پر انسانی فکر نے اللہ کو کائنات کا رب، خالق، حیّ و قیوم اور علیم و خبیر پہلے ہی تسلیم کر لیا ہے۔ اب صرف یہ بات رہجاتی ہے کہ خود انسان کو یہ کیسے پتہ چلے کہ خالق کائنات نے انسان کی پیدائش کی کیا غرض رکھی ہے۔ اور کیا مقصد متعین کیا ہے اور وہ کون سا نظام زندگی ہے جسے وہ اس کے لیئے پسند فرماتا ہے یہی وہ لمحۂ فکری ہے جہاں انسانی عقل تنہا اور ذاتی طور پر اس نظام زندگی کے تفصیلات پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی اور اگر فیصلہ کر سکتی ہے تو بس اسقدر کہ خالق کائنات کی واحد و یکتا ذات نے انسانی ہدایت کے لیئے کوئی نہ کوئی

ایسا انتظام ضرور کیا ہوگا جو اس موقع پر عقل و فکر کی رہنمائی کر سکے اور کھلے لفظوں میں یہ بتا سکے کہ اللہ انسان سے فلاں بات چاہتا ہے اور فلاں بات نہیں چاہتا اور اس کے یہ اعمال پسند کرتا ہے اور وہ اعمال پسند نہیں کرتا پھر ساتھ ہی انسان کی فکر اسے یہ بات بھی بتا دیتی ہے کہ اس قسم کی ہدایت کا انتظام صرف اس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ کسی انسان کو ہی اس کا ہدایت کا منصب عطا کرے اور وہ انسان ایسا ہو جو اللہ کی بارگاہ سے پورا علم اور کامل معرفت حاصل کر کے آئے اور انسان کو صحیح راستہ بتانے کے لیئے جن جن باتوں کی ضرورت ہو ان سب سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور اللہ کی مرضی اور منشاء سے کامل طور پر باخبر ہو اور اس کے لیئے اس کا امکان ہی نہ ہو کہ وہ اس کے حکم کو سمجھنے میں غلطی کر لیگا۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا شخص صرف نظریاتی حیثیت ہی سے مرضی خداوندی کا معلّم نہ ہو بلکہ خود وہ اور اسکی زندگی بھی اس تعلیم کا عملی نمونہ ہو تاکہ انسان کو یہ سمجھنے میں کوئی رکاوٹ اور الجھن باقی نہ رہے کہ نظری تعلیم کو عملی لباس کس طرح پہنایا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا

کہ توحید کا عقیدہ ہمیں لازمی طور پر نبوّت و رسالت کے عقیدہ کی طرف لے جائے گا اور ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ اللہ نے اپنے مقررہ اور معیّن کیئے ہوئے انسانی نظام زندگی کی تعلیم کے لیئے یقیناً کچھ انسانوں کو اپنی بارگاہ سے خصوصی علم و کمال دے کر ہدایت کی غرض سے مبعوث فرمایا ہے یعنی اپنے احکام کی تفصیل بتانے کے لیئے بھیجا ہے اور وہ ایسے پاک اور برگزیدہ لوگ تھے جو منشاء الٰہی کے سمجھنے اور سمجھانے میں کبھی غلطی نہیں کرتے تھے اور اُن کی پوری زندگی خود بھی اسی نظام زندگی اور دین الٰہی کا عملی نمونہ تھے جس دین کو اللہ نے انسان کے لیئے پسند فرمایا ہے۔ ایسے ہی پاک لوگوں کو اصطلاح میں نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔ اس طرح عقیدۂ توحید کو اگر پوری جامعیت کے ساتھ تسلیم کیا جائے جس طرح اسلام اور قرآن نے اس کی تعلیم دی ہے تو انسانی فکر انبیاءؑ اور مرسلینؑ کے وجود کو ماننے بغیر نہیں رہ سکتی اور اس کا اقرار کرنا اُس کے لیئے ناگزیر ہو جائے گا کہ صرف انسانی عقل اللہ کے منشاء اور اس کے احکام کو بتانے کے لیئے قطعاً ناکافی ہے جب تک کوئی

معصوم انسان آکر انسانوں کو ان کی تعلیم نہ دے اور اس کا بھی اقرار کرنا اُس کے لیئے لازمی ہو جائے گا کہ عقائد کی صرف نظریاتی حیثیت کوئی معنی نہیں رکھ سکتی جبتک وہ عملی صورت میں نہ آجائے دوسرے لفظوں میں نظریۂ توحید یا نظریۂ نبوّت محض فکری اعتبار سے کافی نہیں ہے جب تک انسان اُس دین اور اس نظام حیات پر عمل نہ کرے جو کائنات کے واحد و یکتا پروردگار نے انسان کے لیئے متعین کر دیا ہے اور ساتھ ہی فکر انسانی کو اس بات کے سمجھنے میں پھر کوئی دشواری نہیں رہ سکتی کہ نظام زندگی صرف وہی انسانی فلاح و نجات کی کامل ضمانت بن سکتا ہے جو اُس کے علیم و خبیر اور کامل ترین رب نے مقرر کیا ہو نہ وہ نظام جو الٰہی نظام کو چھوڑ کر کمزور انسانی عقل نے خود ہی اپنے لیئے بنا لیا ہو - بڑی صاف سی اور سامنے کی مثال ہے کہ گھر کے چھوٹے اور ننھے بچے جس طرح خود زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں وہ طریقہ اُن کے لیئے خطروں اور نقصانات سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور مفید وہ طریقہ ہوتا ہے جو اُن کے بزرگ اور اُن کے سمجھدار بڑے اُن کے لیئے مقرر کرتے ہیں۔

کیونکہ بچے اپنے نقصان اور فائدہ کو اس طرح نہیں جان سکتے جس طرح اُن کے بزرگ سمجھتے ہیں، اللہ اپنی مخلوق کے فائدوں اور نقصانات کو سب سے زیادہ جانتا ہے اس لیئے لازمی طور پر اس کے متعین کیئے ہوئے دین یعنی اس نظامِ زندگی ہی میں جو مخلوقات کی روحانی اور مادّی دونوں حیثیتوں پر پوری طرح حاوی ہے، اُس کی ہر طرح کی فلاح موجود ہے اور اس کے مقابلہ میں اُن نظاموں کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی جنہیں انسان خود اپنے لیئے پسند کرتا ہے۔ اسکا صاف نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ عقیدۂ توحید رکھنے والا انسانی معاشرہ دوسرے معاشروں سے عملی اور نظریاتی طور پر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ توحید کے مفہوم کو صحیح طریقہ پر سمجھے اور اُس کے تقاضوں پر پوری طرح عمل بھی کرے۔ اللہ نے انسانوں کی فلاح و نجات کے لیئے جس دین کو پسند اور متعین فرمایا ہے، وہ صرف اسلام ہے۔ قرآنِ حکیم کا اعلان ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران - ۱۹) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے پھر کچھ آگے بڑھ کر اسی (سورۂ آل عمران ۸۵) میں ہے، وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ " جو

کوئی اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو چاہے گا تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا - یقیناً اسلام کے علاوہ انسان کیلئے اللہ کا پسند کیا ہوا کوئی دوسرا دین نہیں ہے :

وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ-۳) اور اللہ نے تمہارے لیئے اسلام ہی کو بحیثیت دین کے پسند کیا ہے، عقیدۂ توحید انسانی فکر و عمل کی کامل تطہیر کر دیتا ہے سچا موحّد وہی ہے جس کا ذہن پاک ہو فکر پاک ہو ضمیر پاک ہو اور کردار و عمل پاک ہو- فکری اور ذہنی نجاستوں سے بھی اور کردار و عمل کی برائیوں سے بھی -

انسان اور تصورِ آخرت

انسان کے سامنے جو کچھ بھی تھا، اس کی یہی مادّی اور دنیوی زندگی تھی اور وہ یہی سمجھتا تھا کہ اسی زندگی میں اُس کی ابتداء اور انتہا پوشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کو کہیں اور نہیں جانا ہے۔ وہ کچھ اسباب کے تحت پیدا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے اور اس طرح ہمیشہ کے لیئے فنا ہو جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے سورۃ انعام آیہ/۲۹ میں اسی بات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ وَقَالُوٓا اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ ﴿۲۹﴾ وہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری اسی دنیا کی ہے اور ہم کو پھر زندہ کرکے نہیں اٹھایا جائیگا۔

پھر سورۃ المؤمنون آیہ ۳۵/۳۷ میں اس طرح ارشاد ہوا ہے :-

اَیَعِدُکُمۡ اَنَّکُمۡ اِذَا مِتُّمۡ وَکُنۡتُمۡ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّکُمۡ مُّخۡرَجُوۡنَ ﴿۳۵﴾

هَیۡهَاتَ هَیۡهَاتَ لِمَا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۶﴾ اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا

نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ یہ شخص یعنی رسول تم سے یہی کہتا ہے نا کہ جب تم مر جاؤ گے اور تم مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے، تو تم پھر سے زندہ کئے جاؤ گے۔ جو بات تم سے کہی جاتی ہے وہ بہت ہی بعید ہے۔ بس زندگی تو ہماری یہی دنیوی زندگی ہے۔ ہم میں کوئی مرتا ہے کوئی پیدا ہوتا ہے اور ہم ہرگز دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے۔" اسلام نے انسان کو آخرت کا تصوّر دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس دنیوی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے۔ صرف اسی زندگی پر اس کی بقا کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے بلکہ حقیقی اور اصلی زندگی تو وہی ہے۔ یہ دنیوی زندگی تو محض اس کی ایک تمہید اور تیاری ہے۔

اسلام نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ دنیوی اور اُخروی زندگیاں ایک دوسرے سے الگ نہیں کی جاسکتیں۔ جس طرح دنیا کی زندگی اُخروی زندگی کے لیئے ضروری ہے بالکل اسی طرح آخرت کی زندگی دنیوی زندگی کے لیئے بھی لازمی ہے اور چونکہ آخرت کی زندگی اس دنیوی زندگی کا مقصد ہے اس لیئے اصلی حیات اور حقیقی زندگی اُخروی زندگی ہی ہے۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے: وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (عنکبوت/۶۴) عالمِ آخرت ہی درحقیقت زندگی ہے۔ کاش لوگوں کو اس کا علم ہوتا۔ لیکن اسی کے ساتھ دنیوی زندگی کی اہمیت بھی بنیادی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بغیر آخرت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ نے قرآن پاک کے سورۂ قصص آیہ/۷۷ میں فرمایا ہے:

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا

اور جو کچھ تجھے اللہ نے دے رکھا ہے اس میں آخرت کے گھر کی بھی جستجو کر اور دنیا سے بھی اپنا حصّہ فراموش نہ کرنا۔ پھر اس کے ساتھ اسی سورۂ قصص آیہ/۸۳ میں یہ بھی ہے: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وہ عالمِ آخرت تو ہم ان ہی لوگوں کے لیے خاص کر دیں گے جو زمین پر سرکشی اور فساد نہیں چاہتے۔ اور نیک انجام تو صرف پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔ غرض آخرت اور دنیا دونوں ہی ضروری اور لازمی ہیں۔ اور دونوں ہی اپنے اپنے مقام پر اہم ہیں۔ اس طرح یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ان میں ایک دوسرے

کے حصول کے لیئے رکاوٹ نہیں ہے یعنی نہ تو آخرت کی تحصیل دنیا کے حصول سے روکتی ہے اور نہ دنیا کا حصول طلبِ آخرت کے لیئے مانع ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ آخرت کی تحصیل صرف اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب دنیا کی طلب صرف حصول آخرت کے مقصد کی غرض سے ہو اور خود دنیا ہی اصلی اور آخری مقصد نہ ہو کر نہ جائے۔ اور یہ تحصیل دنیا اور طلب آخرت اُن ہی طریقوں کے ساتھ ہو جو عقل اور شریعت کے نزدیک جواز رکھتے ہوں ورنہ آخرت کی تحصیل بھی ممکن نہ ہو گی اور دنیا طلبی کا بھی کوئی جواز باقی نہ رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے جس آخرت کا تصوّر ہمیں دیا ہے اس کا حصول نہ تو مطلق طور پر طلبِ دنیا سے ممکن ہے اور نہ مطلق طریقہ پر ترکِ دنیا سے بلکہ اُس طلبِ دنیا سے ہے جس کی غرض اور جس کا اصلی مقصد حصولِ آخرت ہی ہو اور آخرت کا تصوّر بھی وہی ہو جو اسلام نے دیا ہے۔

اس طرح اسلام قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں نہ خالص دنیا طلبی کی تعلیم دیتا ہے اور نہ رہبانیت کی!

بلکہ اسلامی تعلیمات کے صحیح مفہوم اور نظریہ کے مطابق اس کا تصوّرِ آخرت بہتر سے بہتر دنیوی زندگی کو منع نہیں کرتا بشرطیکہ وہ جائز حدود میں ہو۔ سورۂ اعراف میں (اعراف/۷/۳۲) اللہ نے فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:۔ اے رسول کہدو کہ اللہ کی زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیئے پیدا کی ہے کس نے حرام کر دیا ہے اور کھانے کی پاک وپاکیزہ چیزوں کو کس نے حرام کر دیا ہے۔ سورۂ لقمان/۳۱/۲۰) میں ارشاد الٰہی کا حاصل یہ ہے۔ کیا تم لوگ اس پر غور وفکر نہیں کرتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تمہارے لیئے مسخّر اور تابع بنا دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی تمام نعمتوں کو پورا کر دیا ہے۔

اسی کی طرف سورۂ بنی اسرائیل (بنی اسرائیل/۱۷/۷۰) میں اس طرح اشارہ فرمایا گیا ہے (ترجمہ) اور ہم نے بنی آدمؑ کو عزت دی ہے اور ہم ہی نے خشکی اور دریا دونوں میں انھیں حمل ونقل کے وسیلے عطا کیئے ہیں اور ہم ہی نے انھیں کھانے کی نفیس چیزیں عطا کی ہیں۔ اور ہم نے اُن کو اپنی کثیر مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے ہمارے

لیے دنیا کی زندگی کو کس قدر اہمیت دی ہے اور دنیا کی نعمتیں حاصل کرنا اور اس میں زندگی گذارنا ہمارے لیئے کتنا ضروری ہے اسی کے ساتھ دنیا طلبی محض دنیا طلبی کے لیئے جس میں آخرت کی مقصدیت نہ ہو۔ قرآنِ حکیم کی نظر میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ (انعام ۶/۷۰)
اے رسولؐ اُن لوگوں کو چھوڑ دو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے۔ اور انھیں دنیا طلبی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔"

جہاں تک حدیثوں کا تعلق ہے اُن میں بھی اسی نظریہ کی تشریح کی گئی ہے:۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے اَلدُّنیَا مَزرَعَۃُ لِلاٰخِرَۃِ"۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے۔ اُعمُرِث لِدُنیَاکَ کَاَنَّکَ تَعِیشُ اَبَداً وَاعمَل لِاٰخِرَتِکَ کَاَنَّکَ تَمُوتُ غَداً" اپنی دنیا کے لیئے جو کام بھی کرو اس قدر کوشش سے کرو اور ایسے استحکام سے کرو گویا تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور اپنی آخرت کے لیئے جو کچھ کرو وہ اس قدر توجہ اور

خضوع وخشوع سے کرو، گویا تم کل ہی دنیا سے چلے جاؤ گے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام کے تصورِ آخرت کا مطلب صرف یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں اُس آخرت کی مقصدیت موجود رہے جس کا تعین اللہ نے کیا ہے۔ اس طرح یہ دنیاوی زندگی بھی اسلام کے تصورِ آخرت کے وسیع دائرے میں شامل ہے۔

اشتراکِ عمل

اسلام نے مسلمانوں کو اجتماعی مفاد کی اہمیت پر جس شدت سے توجہ دلائی ہے اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ بلاشبہ انفرادی زندگی کو بھی اُس نے اہمیت دی ہے لیکن اُس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انفرادی زندگی اصل میں بے معنی اور بے روح ہے جب تک اجتماعی زندگی صحیح خطوط پر قائم نہ ہو۔ شاعرِ مشرق نے اسی نقطۂ نظر کی تشریح اس طرح فرمائی تھی ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں (اقبالؒ)

اشتراکِ عمل سے مراد حقیقت میں وہی بنیادی مقصد ہے جس کے لیئے انسان کی پیدائش ہوئی ہے۔ یعنی اشتراکِ باہمی یا دوسرے لفظوں میں، آپس میں مِل جل کر اُس طرح زندگی گذارنا جس طرح خالقِ انسان چاہتا ہے اور جس طرح اُس نے

انسان کو حکم دیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہم بآسانی اس بات کو سمجھ لیں گے کہ جب اسلام "اشتراکِ عمل" کا حامی ہے تو وہ انسان کو کبھی ایسی باتوں کی اجازت نہیں دے سکتا جو علیحدگی اور بے تعلقی کی محرّک ہوں اور باہمی میل جول اور اشتراک عمل کے منافی سمجھی جا سکیں۔

"اشتراکِ عمل" کی اہمیت کا اندازہ اللہ کے اِس ارشاد سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴿۸﴾ (مائدہ) "کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل و انصاف کو چھوڑ بیٹھو - عدل تو تمہیں ہر صورت سے کرنا چاہیئے کہ یہ بات پرہیزگاری سے بہت زیادہ قریب ہے"

ظاہر بات ہے کہ انتقام اور عداوت کے جذبات آدمی کی آنکھوں کو اندھا اور اس کی عقل کو مغلوب کر دیتے ہیں اور وہ بیشتر حالات میں حق و ناحق اور انصاف و ناانصافی میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا اور اس طرح وہ اجتماعی فرائض اور اشتراک عمل کی ذمہ داریاں جو انسانی سوسائٹی

کے ایک فرد کی حیثیت سے اس پر عاید ہوتی ہیں، فراموش کر بیٹھتا ہے اور اس کی نگاہوں میں "اپنی انا" کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عین اسی امتحانی اور سخت ترین آزمائشی لمحوں میں اسلام اس کے لیئے یہ انتہا تلخ، نا قابل تصور اور بے حد کٹھن لیکن ایک ناگزیر اور لازمی و ضروری حقیقت کی طرف اسے توجہ دلاتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی پورے اشتراکِ عمل کا ثبوت دے اور کوئی ایسا عمل نہ کرے جو اجتماعی حقوق کے منافی اور انصاف و عدالت کے خلاف ہو۔ اسی اشتراکِ عمل کی روح اور جذبہ کو اجاگر کرنے کے لیئے سورۂ آل عمران میں یوں فرمایا گیا ہے: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا، "رشتۂ الٰہی کو مضبوط تھامے رہو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔ پھر اس کے بعد ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے اوپر اللہ کے اس احسان کو یاد کرتے رہو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے کتنے سخت دشمن تھے، مگر پھر بھی اللہ نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت و الفت پیدا کر دی اور نتیجہ میں تم اس کے فضل و کرم کی وجہ سے باہم بھائی بھائی ہو گئے۔

اسی اشتراک عمل کے حقیقی جذبہ کو بڑھانے کے لیئے سرورِ کائنات نے مدینہ میں ہجرت کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ مہاجرین و انصار میں سے ہر ایک کو دوسرے کا بھائی بنایا تاکہ ان سے خطہ واریت اور دوسری تفریقوں کے لائق نفرت جراثیم پوری طرح دور ہو جائیں اور یہ سب کے سب نسل و رنگ، زبان، خطہ اور ریاست و عزت اور حکومت و محکومیت کے امتیاز اور تفریق سے بلند ہو کر آپس میں بھرپور اشتراک عمل کا ثبوت دیں اور سب مل کر انسانیت اور اسلام کی خدمت میں لگ جائیں۔

اسلام کی اس تعلیم اور داعی امن اور نبی رحمت اور رسول سلامتی و اتحاد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی مثالوں کے نتیجہ میں مدینہ کے قبائل میں جو برسہا برس سے خانہ جنگی اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا وہ ایک لمحہ میں ٹھنڈا ہو گیا اور خون کی بارش کے بجائے اخوت و محبت کی گھٹاؤں نے برسنا شروع کر دیا اور وہ پشتہا پشت کے دشمن ایک دوسرے کے قلبی دوست اور سچے ہمدرد بن گئے اور ایک دوسرے کے پسینے پر اپنا خون گرانے کیلیئے

تیار ہو گیا، بدلہ لینے اور انتقام کی آگ بجھانے کا خیال ہی دل سے مٹ گیا اور مسلمان کی نگاہوں کے سامنے صرف ایک ہی حقیقت چمکنے لگی — "اتحاد و اخوت اور آپس کا اشتراکِ عمل اور باہمی تعاون" حضورِ انور نے اس اشتراک کا اپنے عمل سے ثبوت دیکر بہترین مثالیں قائم کیں تاکہ دنیا اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لے کہ باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل کی تعلیم محض تخیلاتی اور ذہنی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے ہر موڑ پہ قابل عمل ہی نہیں بلکہ ضروری اور لازمی ہے۔ صلح ہو یا جنگ کے میدان ہوں، اقتصادی زندگی کے تقاضے ہوں یا معاشرتی پہلو ہوں۔ اشتراکِ عمل کے بغیر نہ کوئی فرد یا قوم زندہ رہ سکتی ہے اور نہ ترقی کے راستوں پر آگے بڑھ سکتی ہے۔ حضورِ انور نے مدینہ کی مسجد نبیؐ کی تعمیر میں اپنے صحابۂ کرام کے ساتھ مل جُل کر دوسرے مزدوروں کی طرح ایک مزدور کی حیثیت سے کام کیا۔ مسجد قُبا کی تعمیر میں بھی اسی جذبہ کی عملی تعلیم دینے کے لیے سب کے ساتھ ملکر بھاری بھاری پتھر اٹھاتے رہے۔ میدانِ جنگ

کے ہر موقع پر دوسروں کے ساتھ زخم کھاتے رہے اور پھر غریب ونادار لوگوں کی ہر مصیبت وراحت میں اُن کے شریک حال رہے اور ہمیشہ یہ فرماتے رہے "غَرِیْبٌ جَالَسَ غَرِیْباً، فَقِیْرٌ جَالَسَ فَقِیْراً" ایک غریب ہے جو غریبوں میں ہے، ایک فقیر ہے جو فقیروں کے ساتھ بیٹھا ہے۔

یہ تمام باتیں اس بات کی تعلیم تھی کہ مسلمانوں کو آپس میں اُن تقاضوں کو کسی وقت بھی نہ بھولنا چاہیئے جو اُن کی اجتماعی زندگی کی طرف سے اُن پر عائد ہوتے ہیں اور اسی طرح جس طرح ایک مخلص حقیقی بھائی اپنے بھائی کے ساتھ ہر ضروری موقع پر اشتراک عمل سے کام لیتا ہے انہیں باہم متحد و متفق ہو کر تعاون کی مثال پیش کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اشتراک عمل ہی وہ طاقت ہے جس سے سخت ترین مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ انتہائی کٹھن دشواریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے اور قوی ترین دشمن کو شکست دی جا سکتی ہے۔ کوئی فرد کامیاب زندگی گزار ہی نہیں سکتا جب تک دوسرا افراد اس کے ساتھ اور وہ خود دوسروں کے ساتھ اشتراک عمل نہ کرے۔

کوئی قوم اس وقت تک ترقی کی راہوں پر صحیح صورت میں گامزن نہیں ہو سکتی جب تک وہ خود دوسری اقوام کے ساتھ اور دوسری قومیں اس کے ساتھ اشتراک عمل نہ رکھیں اور اسی طرح کوئی حکومت نہ تو باقی رہ سکتی ہے اور نہ کامیابی کے ساتھ ترقی کر سکتی ہے اور نہ اس کے عوام اور اس کی رعیت خوشحال رہ سکتی ہے اور نہ وہ اندرونی و بیرونی خطروں سے محفوظ رہ سکتی ہے جبتک عوام حکومت کے ساتھ اور حکومت عوام کے ساتھ بھرپور اشتراک عمل کا انتہائی مخلصانہ ثبوت نہ دیں یعنی اگر یہ اشتراکِ عمل زندگی کے انفرادی اور اجتماعی پورے ڈھانچہ میں عام نہ ہوگا اور اس کے تقاضوں کو بھرپور طریقہ پہ پورا نہ کیا جائیگا تو کبھی ہرگز اس کے نتائج خاطر خواہ طریقہ پہ ظاہر نہیں ہو سکتے۔ یہی اشتراکِ عمل بکھری ہوئی اینٹوں کو آپس میں ملا کر ایک مضبوط دیوار میں تبدیل کر دیتا ہے اور پھر یہی ان دیواروں کو باہم اکٹھا کر کے مکان، قصر، اور ناقابل تسخیر قلعوں کی صورت بخشتا ہے۔

حضورؐ انور نے ایک موقع پر یہی مثال دے کر مسلمانوں کو اشتراکِ عمل اور باہمی اخوت و برادری کا سبق دیا تھا۔ غرض آپس کا اشتراکِ عمل۔ افراد اور جماعتوں کی طاقت ہے اور اس کے برخلاف تنہا پسندی میل جول سے نفرت اور افتراق و اختلاف ان کے لیئے سب سے بڑی لعنت اور سب سے زیادہ خطرناک کمزوری ہے جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کے خطرہ کا آسانی کے ساتھ لقمہ بن سکتے ہیں۔

"اشتراکِ عمل" کی یہ اسلامی بنیادی تعلیم سیکڑوں ایسی اجتماعی اور انفرادی برائیوں کو ختم کر دیتی ہے جو انسانی زندگی کے لیئے دیمک بنی رہتی ہیں اور اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی رہتی ہیں مثال کے طور پر اشتراکِ عمل کا جذبہ دوسروں کے ساتھ کبھی ناانصافی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ دوسروں کی مصیبت کی طرف سے بے حسی اور بے توجہی کے وجود کو مٹا دیتا ہے۔ اس کی موجودگی میں تجارتی، زرعی اور انتظامی تمام شعبوں میں کبھی تعطل پیدا نہیں ہو سکتا۔ اشتراکِ عمل ہی

کا جذبہ ہے جو مزدور اور آجر کے درمیان استوار ہو کر دونوں کی بہترین خوشحالی اور کامیابی کی ضمانت دے سکتا ہے اور اشتراک عمل ہی وہ تنہا طاقت ہے جس میں انسانی معاشرے کے ہر طبقہ کے حقوق کی حفاظت کی پوری ضمانت موجود ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اشتراک عمل اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور اس کے بغیر نہ تو فرد اور نہ قوم ترقی کر سکتی ہے اور نہ باقی اور محفوظ رہ سکتی ہے اسی طرح جس طرح ایک کشتی بغیر اشتراک عمل کے سفر نہیں کر سکتی، ایک فیکٹری چل نہیں سکتی۔ ایک مکان کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ کسی کھیت میں زراعت نہیں کی جا سکتی، کسی سڑک کو بنایا نہیں جا سکتا، کسی کنویں اور نہر کو کھودا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح فرد، قوم اور ملک کی فلاح اور خوشحالی صرف اشتراک عمل ہی میں مضمر ہے۔

روزہ اور روحانیت

ہر مسلمان اس حقیقت سے واقف ہے کہ روزہ ارکانِ اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اور یہ وہ عبادت ہے جو دنیا کے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر آخری رسول حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہر پیغمبر کے ذریعہ سے اُن کی امت کو بتائی گئی اور اس امت پر فرض کی گئی۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ تک ہر ماہ کے تین روزے فرض تھے یعنی ۱۳، ۱۴، اور ۱۵ کے۔ ان ہی تین دنوں کو "ایام بیض" یعنی "نور کے دن" کہا جاتا ہے۔ پھر حضرت نوحؑ کے بعد جو جو شریعتیں آتی رہیں اُن میں دنوں اور زمانہ کے کچھ تغیر کے ساتھ روزہ کا حکم باقی رہا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو جو خیرُ الامم قرار دی گئی ہے ماہ رمضان کے روزوں کا حکم

سنہ ۲ھ شعبان کے مہینہ میں ملا تھا۔ اب ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ "روزہ" کہتے کسے ہیں اور صحیح معنی میں روزہ دار کون ہوسکتا ہے؟

کیا محض ایک خاص وقت سے ایک خاص وقت تک دن بھر صرف بھوکے اور پیاسے ہی رہنے کا نام روزہ ہے یا اس کے لیئے کچھ مخصوص شرطیں بھی ہیں جن کے بغیر حقیقی معنی میں "روزہ" نہیں ہوسکتا۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں "روزہ" کے کچھ احکام بھی تعلیم دیئے گئے ہیں اور کچھ شرائط اور صفات سکھائی گئی ہیں جن کے بغیر وہ اصلی غرض حاصل نہیں ہوسکتی جس کے لیئے "روزہ" رکھا جاتا ہے یعنی پرہیز گاری اور تقوٰی اور جس کی طرف لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" کا جملہ فرما کر اللہ نے ہمیں متوجہ کیا ہے۔ سورۂ بقرہ کے اسی مقام پر جہاں "روزہ" کے فرض ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔ "تقوٰی" اس صفت کا نام ہے کہ انسان تمام اُن باتوں سے اپنے نفس کو بچائے جنہیں اللہ نے برا قرار دیا ہے اور ان باتوں پر عمل کرے جن کا اس کو حکم دیا ہے۔ مثلاً جھوٹ نہ بولے، چوری نہ

نہ کرے، رشوت ستانی نہ کرے۔ کسی پر ظلم نہ کرے۔ کسی کا مال غصب نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ پہنچائے، کسی کی پیٹھ پیچھے برائی نہ کرے، قطع رحم نہ کرے، کسی کا حق نہ مارے، ذخیرہ اندوزی نہ کرے۔ اشیاء صرف اور دوسری تجارتی چیزوں میں ملاوٹ نہ کرے، کسی کو دھوکا نہ دے منہ سے برے اور گندے لفظ نہ نکالے اور اسی طرح کے دوسرے اسلامی احکام پر بھرپور عمل کرے ورنہ اگر کسی نے احکام الٰہی اور اخلاق اسلامی سے روگردانی کی تو پھر دو باتوں میں سے ایک بات لازمی ہے یا تو وہ سرے سے روزہ ہی باقی نہ رہے گا۔ یا پھر صرف ظاہری روزہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور فاقہ یعنی بھوک پیاس کے علاوہ اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔

"روزہ" کا سب سے بڑا مقصد تزکیۂ نفس اور اصلاح روح ہے کیونکہ اس کے بغیر درست اور اصلی اسلامی ایمانی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایک بنیادی بات یہ ہے کہ انسان کے دل میں گناہ کی طرف رغبت اکثر و بیشتر نفسانی اور حیوانی خواہشات

کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور روزہ وہ عمل ہے اور وہ عبادت جسکی وجہ سے ان حیوانی اور نفسانی خواہشات کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور خود بخود انسان نیک اعمال کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا تھا کہ نفس انسانی کی گہرائی سے برائیوں کا قلع قمع اور انھیں مٹانا اور دور کرنا صرف دو وسیلوں ہی سے ممکن ہو سکتا ہے ایک تو نماز ہے اور دوسرا وسیلہ روزہ ہے بغیر ان دو وسیلوں کے انسان کی روح اور اسکے نفس کی گہرائی سے بدی اور برائی کی جڑ نہیں کٹتی بشرطیکہ نماز اپنے پورے صفات کے ساتھ ایک سچے مسلمان کی پرخلوص نماز ہو اور روزہ اپنے تمام شرائط کے ساتھ ایک پکے توحید پرست کا پر اخلاص روزہ ہو اور مؤمن کے کانوں میں یہ الٰہی صدا آنے لگے کہ "الصوم لی وانا اجزی بہ" میرے بندۂ مؤمن کا روزہ صرف میرے ہی لیئے ہے اور اب اس کے لیئے اس روزہ کی جزا میں خود ہی ہوں یا اس کی جزا میں خود ہی دوں گا۔

روزہ کے اجتماعی فوائد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ

سورۂ بقرہ آیہ/ ۱۸۳ میں اللہ نے فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح اُن لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل گذرے ہیں تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ یہ گنتی کے چند دن ہیں" اس ارشاد ربانی سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ روزے فرض کئے جانے کی اصلی غرض یہی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کا خوف پیدا ہو اور وہ عمل کے اعتبار سے سچے مسلمان بن جائیں اور پرہیزگار ہو جائیں اس بنا پر وہ روزہ حقیقی معنوں میں روزہ نہیں ہو سکتا جس کے رکھنے والے ہیں

پرہیزگاری کی صفت نہ پیدا ہو سکے۔ اسی بات کی طرف ایک حدیث میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ ان لفظوں میں جن کا حاصل یہ ہے کہ "اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر بھی گناہوں کو ترک نہ کرے تو پھر اللہ کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے" اور کبھی آپ نے اس طرح فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ "کتنے ہی ایسے روزہ دار ہیں جنہیں بھوکا پیاسا رہنے کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا" اس کا نتیجہ صاف طور پہ یہی نکلتا ہے کہ صوم یعنی روزہ صرف بھوکے اور پیاسے ہی رہنے کا نام نہیں ہو سکتا اور ان تمام شرطوں کا نچوڑ یہی ہے کہ روزہ دار ان تمام باتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے جو پرہیزگاری کے منافی ہیں اور جسم کو ان تمام بے اعتدالیوں سے بچائے جن سے شریعت نے روکا ہے۔

روزہ میں جہاں اور بے شمار فائدے ہیں اور جسم و روح کی سیکڑوں بیماریاں دفع ہو جاتی ہیں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ آپس کی محبت اور باہمی ہمدردی کے

جذبہ میں بے پناہ اضافہ کا باعث ہوتا ہے اور اگر یہ جذبہ سرے سے موجود ہی نہ ہو تو اس کو پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک نئی روح آجاگر ہو جاتی ہے۔ ہم اس بات کو اس طرح آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص خود کسی مصیبت اور تکلیف اور آزمائش میں مبتلا نہ ہو اس وقت تک اسے دوسروں کی تکلیف کا صحیح طور پہ احساس نہیں ہوتا۔ اس لیئے جب کوئی روزہ رکھتا ہے اور اسے دن بھر بھوکا اور پیاسا رہنا پڑتا ہے اور وہ اس عرصہ میں زندگی کی اکثر و بیشتر لذتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے دل میں ان غریب، مفلس اور بھوکے لوگوں کا بھی خیال آجائے گا جن پر کئی کئی دن گذر جاتے ہیں مگر انھیں کھانے کی کوئی چیز میسر نہیں آتی۔ اس روزہ دار کے دماغ میں ان محتاجوں اور بے سہارا لوگوں کی تکلیف کا شعور بیدار ہوگا اور ان سے ہمدردی کا احساس ابھرے گا۔ اس طرح امیر

اور غریب، بڑے اور چھوٹے سب میں باہمی جذبہ محبت و یگانگت کی تخلیق ہوگی اور آپس کے تعاون کی طرف اسلامی معاشرہ کا ہر فرد مائل ہوگا۔ اسی بات کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مشہور خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ جو شخص اپنے ایک مؤمن بھائی کا روزہ افطار کرائے اسے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ وَلَوْ بِشَرْبَةٍ مِنْ مَّاءٍ "یعنی اگرچہ وہ افطار کھجور کے آدھے دانہ ہی پر یا پانی کے ایک گھونٹ ہی پر کیوں نہ ہو۔

یہ حکم اسی لئے دیا گیا تھا کہ مسلمانوں میں اجتماعی روح ابھرے اور آپس کے تعاون اور ہمدردی کا جذبہ اجاگر ہو کیونکہ فرد ہو یا قوم کسی کو بھی باہمی تعاون کے بغیر فلاح نصیب نہیں ہوسکتی۔

بُخل ایک اخلاقی بُرائی

بُخل یعنی کنجوسی ایک ایسی بنیادی بُرائی ہے جس کی وجہ سے انسان اخلاقی برائیوں کے ایک وسیع سلسلہ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بُخل کے معنی یہ ہیں کہ جہاں مال کو خرچ کرنا ضروری ہو وہاں اسے خرچ نہ کیا جائے اور اُسے جمع رکھنے کی خواہش کو ہر ضرورت اور ہر استحقاق پر مقدم رکھا جائے یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس قسم کا جذبہ اگر نفس میں پیدا ہو جائے تو اس کے بُرے نتائج غیر محدود ہوں گے اور وہ بد اخلاقیوں اور برائیوں کا ایک مجموعہ بن جائے گا۔ اس طرح بخل کی بد ترین عادت انسان کو ظلم اور بے رحمی کی طرف دعوت دیتی ہے، وہ اُسے بے مروّت بنا دیتی ہے۔ بدسلوکی اور لیست اخلاقی سکھاتی ہے۔ لالچ، تنگ نظری، خیانت اور فریب کا سبق دیتی ہے بخل کی صفت چونکہ بے دردی اور بے رحمی کے جذبات کی تخلیق کرتی ہے اس لیے اس کا بہت بڑا نقصان ایک فرد کے ساتھ

سانحہ معاشرہ کی تنظیم کو ہوتا ہے۔ یہ بدترین صفت جس حد تک بھی پھیلے گی اسی حد تک قومی تنظیم اس سے متاثر ہوتی چلی جائے گی اور جن لوگوں میں یا جس قوم میں یہ بری عادت موجود ہوگی وہ کبھی ترقی کی راہ پر نہیں چل سکتی اور اس میں کسی وقت بھی اجتماعی زندگی کی روح پیدا نہیں سکتی۔ اسلام نے اس برائی کو روکنے کی سخت کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم کے ارشادات، حدیث نبوی اور عمل اصحاب کبار اور اہل بیت اطہار ہمارے لیے بہترین مثال ہے قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے:- وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (سورہ آل عمران آیہ/ ۱۸۰)

جن لوگوں کو خدا نے اپنے فضل وکرم سے کچھ عطا فرمایا ہے اور پھر وہ کنجوسی کرتے ہیں وہ ہرگز اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ عمل ان کے لیے بہتر ہوگا بلکہ یہ اُن کے حق میں بہت برا ہے جس مال میں وہ بخل کرتے ہیں عنقریب قیامت کے دن اُس کا طوق بنا کر اُن کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

سورۂ حدید میں ارشاد ہوتا ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۔ اور اللہ کسی اترانے والے اور شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا جو خود کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ سورۃ اللیل میں ہے ۔ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ﴿۱۱﴾ جس نے بخل کیا اور بے پروائی کی اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اسے سختی یعنی جہنم میں پہنچا دیں گے اور جب وہ ہلاک ہوگا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

بخیل آدمی کو کبھی زندگی کی کوئی لذت حاصل نہیں ہوتی اور ہمیشہ وہ مشکلات اور مصیبتوں کا شکار رہتا ہے۔ ایک طرف بخل کی بری عادت اسے اپنا پیسہ کسی کام میں خرچ نہیں کرنے دیتی اس لیئے وہ انفرادی مصائب میں مبتلا رہتا ہے، اور دوسری طرف وہ چونکہ دوسروں کا شریک حال نہیں ہوتا اس لیئے دوسرے بھی فطری طور پر اس کی کوئی مدد نہیں کرتے اس کے نتیجہ میں وہ ہمیشہ انفرادی اور اجتماعی مصائب اور تکلیفوں میں مبتلا رہتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ دولت

جمع رکھنے کی ہوس اور فکر میں اپنے سارے فرائض کو بھول جاتا ہے۔

اسلام نے ہر مسلمان کو اس کی تعلیم دی ہے کہ وہ بُخل کی عادت کو کبھی اختیار نہ کرے اور مستحق ضرورتمند لوگوں کی ہر ممکن مالی و اخلاقی امداد کرنے میں کسی وقت بھی دریغ نہ کرے محتاجوں اور غریبوں کی حاجتوں کو پورا کرے اور طرح طرح سے خیرات کرنے اور خدا کی راہ میں مال و دولت صرف کرنے کی اس کو تاکید کی گئی ہے۔

حضرت امّ المومنین خدیجہ رضؓ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے کچھ صفات ایک موقع پر بیان فرمائے تھے وہ یہ تھے:۔

یا رسولؐ اللہ آپ قرابت داروں کا حق اور مقروض لوگوں کا قرضہ ادا کرتے ہیں، غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں، مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور جن پر مصیبت پڑتی ہے اُن کی مدد فرماتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا آپ کی مدد نہ کرے۔

اصل یہ ہے کہ کنجوسی اور بخل ایک ایسی بیماری ہے جو خدا کے وجود اور آخرت پر سچا اعتقاد نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لیئے کہ جو جزا و سزا پر ایمان نہیں رکھتا اور اس کو اس کا

یقین نہیں ہوتا کہ اللہ کی بارگاہ سے آسے اس کے اعمال کی جزا عطا ہوگی وہ اپنی اسی دنیاوی کمائی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنی دولت کو آسانی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ سورۂ "مدثر" میں دوزخیوں کے سوال وجواب کا ذکر ہے:۔

"اُن سے پوچھا جائے گا کہ تم جہنم میں کیوں ڈالے گئے ہو تو وہ جواب دیں گے کہ "ہم نماز نہیں پڑھتے تھے" اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، حق کے مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم بھی دینِ حق پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ اور یہ اس وجہ سے تھا کہ ہم اپنے اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے"۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بخل کی برائی جہنم کی آگ تک پہنچائے بغیر نہیں رہتی اور اس کا بنیادی سبب صرف یہ ہے کہ انسان کو عمل کی جزا اور سزا پر اعتقاد نہیں ہوتا اور وہ اس حقیقت پر ایمان نہیں رکھتا کہ آخرت بھی کوئی چیز ہے اور وہاں کی نعمتوں کے مقابلہ میں اس دنیا کی فانی اور تھوڑی سی راحت اور دولت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس بحث کا ایک پہلو

یہ بھی ہے کہ اگر کوئی فیاضی کرتا ہے اور اُسے اس کا یقین اور اعتقاد نہیں ہے کہ اس کے اس عمل کی کوئی جزا خدا کی بارگاہ سے ملے گی تو ایسی فیاضی بھی خدا کے نزدیک قبول نہ ہوگی کیونکہ اللہ کی بارگاہ میں خیرات اور فیاضی کی بڑی شرط یہی ہے کہ خرچ کرنے والا اس پر ایمان بھی رکھتا ہو کہ اسے اس نیک عمل کی جزا ملے گی اور خدا کی بارگاہ میں اس کا یہ عمل بیکار نہ ہوگا بشرطیکہ اُس میں پورا خلوص موجود ہو۔

بخیل آدمی اس حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے کہ روپیہ پیسہ اپنے مقام پر خود کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ذاتی طور پر مقصود ہو بلکہ اُسے صرف اس لیئے حاصل کیا جاتا ہے کہ وہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لیئے جب تک اسے خرچ نہ کیا جائے گا اس وقت تک جو ان کے اصلی مقاصد ہیں کسی طرح کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان اغراض میں اعلیٰ ترین مقاصد و اغراض وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کے ذریعہ سے ہم کو

تعلیم دییئے ہیں اور جن کا فائدہ اس دنیا میں بھی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی جو کچھ اس کا فائدہ ہوگا وہ ہمیں کو حاصل ہوگا خدا اور رسولؐ کو ہماری فیاضی سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے جو کچھ اس میں نفع ہے وہ ہمارا ہی ہے اور ہمارے ہی فائدہ اور ہمارے ہی نفع کے لیئے ہم کو یہ سب ہدایتیں کی جاتی ہیں۔

اُمتِ وسط کا قرآنی مفہوم

قرآنِ حکیم میں اللہ کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

(سورۂ بقرہ آیت ۱۴۳) اور اسی طرح یعنی جس طرح امتِ مسلمہ کے لیے کعبہ کو بہترین قبلہ بنایا گیا خود اس امت کو بھی پسندیدہ اور خیر الامم قرار دیا گیا ہے تاکہ تم دوسری امتوں پر گواہ رہو اور تم پر خود رسول ص گواہ رہیں۔ "وسط" اسے کہا جاتا ہے جو انتہائی اعتدال پر ہو اور اس میں کسی قسم کا ٹیڑھاپن اور کمی یا زیادتی نہ ہو۔ عام طور پر اس لفظ کو تعریف کے مقام پر بولا کرتے ہیں۔ غرض یہ لفظ منتخب یعنی چنا ہوا اور پسند کیا ہوا یا وہ جو انتہائی نقطۂ اعتدال پر ہو اور وہ جو عیب اور نقص سے خالی ہو ان سب کے لیئے بولا جاتا ہے اور مقصود یہ ہے کہ اللہ نے ملتِ مسلمہ کو پورے عالم انسانیت اور ساری دنیا

کے لیئے بطور نمونہ قرار دیا ہے اور اس کی حیثیت اسقدر ممتاز اور بلند ہے کہ وہ دوسری اُمتوں کے اعمال اور افعال پر گواہ مقرر کی گئی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ "امت وَسَط" سے مراد ایسے ہی لوگ ہوں، جو اس معیار پر اتر سکتے ہیں جسے اللہ نے اُن کے لیئے مقرر کر دیا ہے۔ اگرچہ "اُمّتِ وَسَط" کا جملہ جن لوگوں کے لیئے بولا گیا ہے وہ لازمی طور پر امّتِ محمدؐی ہی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کا مصداق ہر کس و ناکس نہیں ہو سکتا بلکہ صرف ایسے ہی لوگ اس کا اصلی اور حقیقی مصداق ہیں جو اپنے ایمان و تقوٰی، علم و معرفت اور حُسن عمل کے اعتبار سے ایسے مرتبہ پر ہوں جو اللہ اور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے نزدیک نقطۂ اعتدال پر ہو اور اس میں کسی طرح کی کمی اور عیب یا ضعف اور کمزوری نہ ہو تاکہ وہ دنیا کی ہر قوم کے لیئے ایک مثال بن سکیں جبکہ خود "امتِ وَسَط" کے لیئے سرورِ کائنات کی ذاتِ اقدس ایک مثال اور نمونہ ہے۔ "وَسَط" کا لفظ عربی زبان میں مختلف موقعوں پر اسی مفہوم کے ساتھ

بولا جاتا ہے ۔ جیسے قریش مکہ کو "وسطِ عرب" کہا گیا ہے ۔ اسی طرح نمازِ عصر کو "صلوٰۃِ وُسطیٰ" کہا گیا ہے لغت اور دین کی بول چال میں ہمیشہ "وسط" اسی جگہ کے لئے بولتے ہیں جہاں کسی چیز کا امتیاز ، خوبی ، افضل اور اشرف ہونا اور اسی طرح کی دوسری صفتیں بیان کرنا مقصود ہو ۔

قرآنِ حکیم میں اسی مفہوم کو متعدد بار دوسرے لفظوں میں بھی بول کر امتِ محمدیؐ کے اس مخصوص اور مثالی طبقہ کو پہچنوایا گیا ہے سورۂ حج آیہ ۷۷/۷۸ میں اس طرح فرمایا گیا ہے ترجمہ یہ ہے " اے ایمان والو ! رکوع کیا کرو اور سجدے کیا کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو" وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ" اور نیکیاں کرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ اور اللہ کے راستہ پر سعی و کوشش کرتے رہو جو کوشش کرنے کا حق ہے" هُوَ اجۡتَبٰٮكُمۡ" اسی نے تمہیں امتیاز عطا کیا ہے اور اس نے تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں کی ۔ تم اپنے باپ ابراھیمؑ کی ملت پر قائم رہو" هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ" اللہ ہی نے تمہارا نام

مسلمان" رکھا ہے۔

اس جگہ بھی یہی مطلب ہے کہ امتِ مسلمہ کو اللہ نے دین حق کی وجہ سے امتیازہ عطا فرمایا ہے۔ اور وہ شرف دیا ہے جو دوسری قوموں کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسی حقیقت کی طرف سورۂ آل عمران آیہ/۱۱۰ میں " کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ " فرما کر اشارہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے: تم سب امتوں سے بہتر اور افضل امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کے لیئے پیدا کی گئی ہے۔ تم دوسروں کو نیک کاموں کے کرنے کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

غرض اس کا حاصل یہ ہوا کہ جس طرح اس اُمتِ مسلمہ کے لیئے حضورؐ انور کو جو تمام کائنات کے سردار ہیں اور تمام انبیاؑء و مرسلینؑ سے افضل و اشرف ہیں قیامت تک کے لیئے رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اسی طرح خود اس امت کو بھی " خیر الامم " بنایا گیا ہے۔ اس کے لیئے علم و معرفت کے تمام دروازے کھول دیئے گئے۔ یہ امت کسی خاص مُلک، خطہ اور رنگ و نسل و زبان سے خصوصیت نہیں رکھتی بلکہ

اس کا تعلق سارے عالم اور پوری انسانیت سے ہے۔ اس کی پیدائش اسی لیئے ہوئی ہے کہ یہ تمام انسانی نسل کی خیر خواہی کرے، اُسے ہدایت کے راستہ پر لگائے، اچھائی اور نیک باتوں کی تعلیم دے اور برائیوں سے روکے۔

مقصود یہ ہوا کہ اس امت کی ذمہ دارانہ حیثیت صرف اسی بات میں محدود نہیں ہے کہ یہ خود اچھی صفتیں اپنے اندر پیدا کرلے اور خود ہدایت پہ ہو اور ہدایت پر رہے بلکہ اسکی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ یہ دوسروں کو بھی اچھا بنائے اور اُنکی ہدایت کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام آسانی کے ساتھ کسی کو نہیں حاصل ہوسکتا اور اس "امّتِ مسلمہ" میں بھی ہر ہر فرد کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جب تک خود کوئی شخص ہدایت پہ نہ ہوگا کسی دوسرے کو ہدایت نہیں کرسکتا۔ شمع خود روشن ہوکر دوسری شمعوں کو روشن کرتی ہے۔ بجھی ہوئی شمع دوسری چیزوں کو روشنی نہیں دے سکتی۔ اسی بنا پہ اس قسم کی تمام آیتوں میں جہاں کہیں بھی "امّتِ وَسَط"، یا "خیرامّۃ" یا "اِجتبَاکُم" وغیرہ کے جملے بولے گئے ہیں وہاں مراد اسی "اُمّتِ محمدیؐ" کے ایسے لوگ ہیں جو ہدایت و ایمان اور تقویٰ

پاک دامنی، اتباع حق اور اطاعتِ خدا و رسولؐ میں اُس مرتبہ پر ہوں جسے اللہ نے اُن کے لیۓ پسند فرمایا ہے۔ ایسے ہی لوگ ان القاب کا صحیح استحقاق رکھتے ہیں اور وہی اس کا بھی حق رکھتے ہیں کہ خود اس امت کے ایسے افراد کی ہدایت کریں جو اس مرتبہ پر فائز نہیں ہیں یا صرف نام ہی کے مسلمان ہیں اور اسلام کی تعلیم سے کچھ بھی مس نہیں رکھتے اور ایسے اعمال و افعال کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں جو اسلام کی تعلیم و ہدایت کے قطعاً خلاف ہیں۔ بلاشبہ امتِ مسلمہ کو اللہ نے بہترین امت بنایا ہے اور اسے دنیا بھر کی امامت ہدایت کا حق دیا ہے لیکن بہر حال اس جلیل عہدہ کے حقدار اسی امت میں صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود بھی خدا و رسولؐ کے سچے دل سے اطاعت گزار ہوں اور اس منصبِ جلیل کو حاصل کرنے کی جو شرطیں مقرر ہیں وہ سب اُن میں پورے کمال کے ساتھ پائی جاتی ہوں جن میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ صحیح معنی میں ایمان رکھتے ہوں اور حقیقی ایمان بغیر یقینِ محکم اور بغیر سچے دل سے اعتقاد حاصل ہوۓ وجود میں نہیں آ سکتا یعنی ایسا اعتقاد جس میں شک و شبہہ

کی قطعی طور پر گنجائش ممکن نہ ہو اور اسلام کے دین حق ہونے پر انہیں پکا یقین ہو۔ زبان پر بھی حق کا اقرار ہو، دل میں بھی اس اقرار کی کامل تصدیق ہو اور اعمال وافعال سے بھی اس یقین و اقرار کی تائید ہو رہی ہو۔ اگر کسی مسلمان میں عمل اور اعتقاد کی یہ شرطیں موجود نہ ہوں گی تو وہ "امتِ وسط" یا خیر الامم" کے لقب کا مصداق نہ بن سکے گا۔ اور اس دائرہ میں شامل ہونے اور فضیلتوں کے حصول کا استحقاق پیدا نہ کر سکے گا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ یہ امت یقیناً دنیا بھر کی تمام امتوں سے افضل ضرور ہے مگر افضلیت کے اس معیار پہ پورا اترنے کے لیئے ایمانِ کامل اور عملِ صالح اور اللہ و رسول کی سچے دل سے اطاعت و بندگی لازمی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ احکام الہٰی کی خلاف ورزی، نافرمانی، بدعملی، نفاق، فسق وفجور، چوری، بد دیانتی، انتشار و فساد پھیلانا، خیانت کرنا، زنا کاری، شراب نوشی، سود خوری، ظلم کرنا، کسی کا حق غصب کرنا، اپنے بھائیوں کو تکلیف دینا اور ان کی تکلیف سے خوش ہونا اور اسی طرح کی دوسری دینی اور سماجی برائیوں کا اختیار کرنا، دھوکا، فریب، جھوٹ وغیرہ سے

ہوتے ہوئے افضلیت کا یہ معیار جمع نہیں ہو سکتا یعنی ایسے نام کے مسلمان جو ان نافرمانیوں اور گناہوں کا ارتکاب کریں وہ "اُمّتِ وَسَط" اور "خیرُ الامم" کے دائرہ میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی کو "خیرُ الامم" اور "اُمّتِ وَسَط" کے مفہوم اور معیار کو دیکھنا ہے تو یہ بات دیکھ لے کہ اس مرتبہ کے حصول کی جو شرطیں مقرر ہیں وہ پائی جاتی ہیں یا نہیں۔

اللہ نے اُمّتِ محمّدی کو بے حد شرف عطا فرمایا ہے لیکن ہمارے لیئے یہ لازمی اور ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس قابل بنایئں کہ صحیح معنی میں ہم سچے مسلمان بن سکیں اور واقعی طور پر "افضل امم" کے دائرہ میں داخل ہو سکیں۔

خود غرضی

خود غرضی کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آدمی اپنی ذات اور اپنے فائدہ کو دوسروں کی ذات اور اُن کے فائدہ پر مقدم رکھے خواہ اس سے دوسرے کو کتنا ہی نقصان پہنچتا ہو۔

درحقیقت یہ وہ بری خصلت ہے جس سے اکثر بری عادتوں اور اخلاقی خرابیوں کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور پھر نتیجہ میں یہ ایک بُرائی نہیں رہتی بلکہ برائیوں کا مجموعہ بن جاتی ہے خود غرض انسان کو کسی کام کے واقعی جواز اور اس کی خوبی سے کوئی غرض نہیں ہوا کرتی اور نہ اُس کے سامنے کوئی ایسا مقصد ہی ہوتا ہے جس کی بنیاد معقول ضابطوں اور ٹھوس اور سچے اصول پر قائم ہو۔ اُس کا تو سب سے بڑا ضابطۂ زندگی اور اکیلا نقطۂ نگاہ صرف اس کی اپنی ذات اور اپنا ہی فائدہ ہوا کرتا ہے۔

خود غرضی ایک ایسا خطرناک مرض ہے جو قوموں اور

ملکوں کو بھی اسی طرح تباہ کر دیتا ہے جس طرح افراد کو برباد کرتا ہے۔ اس سے لاقانونیت کے جراثیم کی تخلیق اور پرورش ہوتی ہے، حرص اور کنجوسی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اپنے مقصد کی تحصیل کے لیئے ناجائز اور غیر آئینی ذرائع اور وسیلوں کو اختیار کرنے کی طرف طبیعت میں رغبت پیدا ہوتی ہے۔ دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے اور اُن پر ظلم کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ اور اس جذبۂ ظلم میں اس بُری صفت کی وجہ سے بڑا اضافہ اور بڑی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ خود اِس لفظ سے ظاہر ہے اس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ جو کچھ بھی فائدہ ہو وہ اپنا ہی ہو اور جب کبھی دوسروں کا مقابلہ ہو تو اپنی ذات ہی کو مقدم رکھنے کی کوشش کی جائے اور جب کوئی کام کیا جائے تو اس میں اپنا ذاتی مفاد ہی پیشِ نظر رہے۔

اس بُری صفت کی وجہ سے آدمی سچّائی سے دور ہو جاتا ہے، اُس کے قول و فعل میں دیانت اور امانت باقی نہیں رہتی، وہ رحم و کرم اور انصاف کے جذبہ سے

محروم ہو جاتا ہے۔ عہد کی پابندی، احسان کرنا، ایثار و قربانی، دوسروں کے دکھ درد کا احساس، یہ تمام اعلیٰ صفتیں خود غرضی کی ضد ہیں اور جہاں وہ ہوتی ہے یہ صفتیں نہیں پائی جاتیں بلکہ ان کے بجائے طبیعت میں خیانت، غدّاری، بے ایمانی، حسد اور بدگوئی، ظلم اور ناانصافی جیسی دوسری سنگین برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

یہ سب اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ خود غرض آدمی ساری دنیا سے پہلے صرف اپنی ہی ذات اور اپنے ہی فائدہ پر نظر کرتا ہے اور دوسروں پر اسے ترجیح دیتا ہے۔ اسلام نے انسان کے اسی خطرناک جذبہ کو کچلنے کے لئے اُسے ایثار کی تعلیم دی ہے اور اُسے سکھایا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے اوپر مقدم رکھنے کی عادت ڈالے اور اس جذبہ کو جس قدر بھی ممکن ہو ترقی دے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٩﴾

(حشر آیہ/۹)

اپنے اوپر سختی اور تنگی ہی کیوں نہ ہو مگر وہ (صاحبان

ایمان) دوسروں کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنی طبیعت کی حرص سے بچا لیا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔"

خود غرضی۔ نفس کی خواہشوں پر بے روک ٹوک عمل کرنے کا سبب بنتی ہے۔ جس کی وجہ سے انسان ہلاکت میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسلام نے اُسے اس خطرہ سے آگاہ کر دیا ہے۔

قرآن مجید میں خدا کا ارشاد ہے: اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

(پارہ ۲۵ سورہ جاثیہ آیت ۲۳) کیا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور خدا نے اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے (اس) علم کی بنا پر (کہ اس میں ہدایت حاصل کرنے کی استعداد اور قابلیت باقی نہیں رہی ہے) اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے پھر خدا کے سوا اس کی ہدایت کون

کر سکتا ہے تو کیا تم لوگ اتنا بھی غور نہیں کرتے۔

دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہوا ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (سورۂ قصص آیت/۵۰) اور جو شخص خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش نفس کی پیروی کرے اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا۔ بے شک خدا سرکش لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ اور ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (پارہ ۲۳ سورۂ صٓ/۲۶) یعنی نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ یہ پیروی تمہیں خدا کی راہ سے بہکا دے گی۔ یہ قابل نفرت خصلت یعنی خود غرضی جس خواہش نفس کی اندھی پیروی اور تقلید کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے اس کے متعلق قرآن کریم کی ہدایت ان آیات کریمہ سے واضح ہو گئی جنہیں ابھی بیان کیا گیا۔

اس کے بعد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا فرمایا ہے اس پر بھی غور کریں۔

ایک حدیث میں آپ فرماتے ہیں:۔ ثَلٰثٌ مُّنْجِيَاتٌ وَ

ثلٰثٌ مُّھلِکَاتٌ فَالْمُنْجِیَاتُ خَشْیَۃُ اللّٰہِ فِی السِّرِّ وَ الْعَلَانِیَۃِ وَ الْحُکْمُ بِالْعَدْلِ فِی الرِّضَا وَ الْغَضَبِ وَ الْاِقْتِصَادُ فِی الْفَقْرِ وَ الْغِنٰی وَالْمُھْلِکَاتُ شُحٌّ مُّطَاعٌ وَ ھَوًی مُّتَّبَعٌ وَ اِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِہٖ (الخلق الکامل) ج ۲ ص ۳۶۵

یعنی تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں جو چیزیں نجات کا سبب ہیں وہ یہ ہیں، ظاہر و باطن میں خدا سے ڈرتے رہنا، غصہ اور رضامندی (سکون) دونوں حالتوں میں عدل و انصاف کے ساتھ حکم دینا، استغنا اور دولتمندی ہو یا فقیری اور تنگدستی ہو، دونوں صورتوں میں میانہ روی اور اعتدال کی راہ اختیار کرنا۔ یہ باتیں وہ ہیں جو انسان کو ہر قسم کی تباہی اور خرابی سے محفوظ رکھتی ہیں، اور جو چیزیں اس کو برباد کر دیتی ہیں وہ یہ ہیں۔ وہ حرص اور لالچ جس کی پیروی کی جائے، وہ خواہشِ نفس جس کی تابعداری اور اطاعت کی جائے، تیسری چیز جو انسان کی تباہی کا سبب ہوتی ہے وہ خود پسندی اور تکبّر و غرور ہے۔ خود غرضی کی بنیاد ان ہی چیزوں پر ہے۔ خود غرض آدمی کی ساری توجہ کا مرکز صرف اس کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے جس کے لیئے وہ حرص، لالچ اور خواہش

نفس پر اندھا دھند عمل کرتا ہے اور نتیجہ میں انفرادی اور اجتماعی ہلاکت اور بربادی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیئے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے مخصوص اغراض و مقاصد اور اپنی ذات کے ساتھ اُن فرائض اور ذمّہ داریوں کا بھی پورا پورا احساس کرے جو اس پر دوسرے انسانوں کی طرف سے عائد ہوتی ہیں، ہر آدمی اپنے معاشرہ کے رشتہ میں جُڑا ہوا ہے اور ہر معاشرہ کی بقا اور ترقی اپنے ہی افراد کی فلاح اور بہبود سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس لیے جب خود غرضی افراد میں پیدا ہو کر ان کی انفرادی زندگی برباد کر دیتی ہے تو پھر معاشرہ خود بخود تباہ و برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔

اس لیئے ہمارا بہت بڑا فرض ہے کہ ہم اپنی نیّتوں کو خود غرضی سے ہمیشہ پاک اور صاف رکھیں۔ اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اس کے نتیجہ میں ہماری انفرادی تباہی بھی ہے اور ہماری اجتماعی بربادی بھی۔

بزدلی

اسلام نے جس کوشش کے ساتھ انسانی معاشرہ سے بزدلی کو دور کیا ہے اور لوگوں میں بہادری اور بلند ہمتی پیدا کرنے کی جدوجہد کی ہے وہ اُس کی پوری تاریخ سے ظاہر ہے حضرت پیغمبرؐ اسلام کی ابتدائی زندگی سے لیکر آپ کی وفات تک اور پھر بعد کے واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تمام تر کامیابیاں اسی پر موقوف تھیں کہ انھوں نے دشمن کے مقابلہ میں خواہ وہ کسی قسم اور کسی حیثیت کا دشمن ہو عام طور پر بڑی بے جگری اور بہادری سے کام لیا اور اسی لیئے وہ اپنی تعداد کی کمی اور اسلحہ وغیرہ کی قلّت کے باوجود دنیا میں پھیلتے چلے گئے اور ایک طوفان کی طرح ہر طرف چھا گئے۔ مسلمانوں پر مکہ میں ایک وقت وہ بھی گذرا تھا جب وہ کئی سال تک شعب ابوطالبؑ میں گھرے رہے - یہ بنی ہاشم کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی جس میں نہ صرف بڑے سن کے مرد بلکہ عورتیں اور بچے بھی تھے۔

اور قریش ان پر قہقہے لگاتے تھے۔ یہ کرب، یہ بے چینی، یہ مصیبت اور تباہی ایک دو دن نہیں گئی برس تک جاری رہی مگر اس چھوٹی سی جماعت کے پیروں میں جنبش نہ پیدا کر سکی جو رسول اللہ پر سچے دل سے ایمان لا چکی تھی اور اسلام کی سچائی کا اعتقاد رکھتی تھی انھوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی بد دلی اور بزدلی کا اظہار نہ کیا اور پوری استقامت اور بہادری کے ساتھ ساری مصیبتیں جھیلتے رہے آخر وہ دن گزر گئے اور جب شعب ابو طالب سے جو پہاڑ کی ایک گھاٹی کا نام تھا چھٹکارا حاصل ہوا تو دوسری قسم کی تکلیفوں کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت رسول کریم اور اصحاب کرام کو مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی اور اپنے سارے آرام و راحت کو ترک کر کے خدا کے یہ نیک بندے اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف چلے گئے۔ اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور یہ قدم کوئی شخص اسی وقت اٹھا سکتا ہے جب اس پر بے انتہا مصیبت پڑے اور وہ وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی تکلیفیں حد سے زیادہ بڑھ چکی تھیں اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا تھا اس لیے ان کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ پھر مدینہ

میں آکر کبھی انھیں چین سے رہنا کہاں نصیب ہوا۔ ایک طرف یہود کی اور منافقوں کی سازشیں تھیں تو دوسری طرف قریش کی یلغار تھی اور بیچ میں مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت تھی جو سیاسی، معاشی اور ہر حیثیت سے تباہ حال تھی لیکن ان سب مادّی کمزوریوں اور مصیبتوں کے باوجود ان کے پاس جو سب سے بڑی طاقت تھی وہ اُن کا عزم محکم اور اپنی سچائی پر یقین کامل تھا، اُن کے دل شجاعت کے جذبہ سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ بہادر تھے، بزدل اور بودے نہ تھے جو خوف، تکلیف اور مصیبت میں دشمن کے سامنے گردن جھکا دیتے۔ رسول کریم نے اپنے ارشادات اور سیرت پاک سے ان کے دلوں میں طوفانی عزم پیدا کر دیا تھا۔ اِس لیئے انھوں نے اپنی بے پناہ قوت عمل کے ذریعہ انسانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا اور اس بے سر و سامان چھوٹی سی جماعت کے قدموں پر جو کل اپنے وطن سے مجبور ہو کر نکلی تھی آج بڑے بڑے بادشاہوں کے تاج لوٹنے لگے اور چند ہی روز میں اس نے انسانی معاشرہ کو ایک نئے طریقۂ فکر اور ایک جدید طرز زندگی کی تعلیم دے دی جس سے انسان کو اس کا پتہ چل گیا کہ اس کا اصلی مقام کیا ہے اور یہ کہ وہ کائنات سے

اشرف اور افضل ہے۔ اُسے اس راز کی بھی خبر ہو گئی کہ وہ خود کائنات کی خدمت کے لئے نہیں بنا ہے بلکہ کائنات کی تخلیق خود اسی کی خدمت کے لیئے کی گئی ہے۔

اسلام نے ہر مسلمان کے دل میں بہادری کی روح پھونکی ہے اور بزدلی کی جڑوں کو کاٹ کر صاف کر دیا ہے اس لیئے کہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ بزدلی انسان کے لیئے زندگی کے ہر میدان میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے لیئے ایک بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا عالم ہو۔ بڑے سے بڑا جسمانی قوت و طاقت رکھنے والا ہو لیکن اگر اس میں بزدلی ہو گی اور جرأت و ہمت نہیں پائی جائے گی تو نہ وہ اپنے علم و فن اور ہنر کو ظاہر کر سکے گا اور نہ اپنی طاقت کا استعمال کر سکے گا بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ بھی کھو بیٹھے گا اس بنا پر کم ہمتی اور بزدلی انفرادی اور ملکی اور اجتماعی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے انسان اُن نعمتوں اور برکتوں کو حاصل کرنے اور اُن سے پورا فائدہ اٹھانے سے قاصر رہتا ہے جو اللہ نے اس کو عطا فرمائی ہیں۔

اسلام نے جس طریقہ پر مسلمانوں سے بزدلی کو دور کرنے

کی کوشش کی ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقیدوں پر ہے جو سچے ایمان اور یقین محکم کا نتیجہ ہیں۔

ایک یہ کہ مادی وسائل کو تو ضرور حاصل کرنا چاہیئے لیکن بغیر نصرت الٰہی اور فضل خداوندی کے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی یعنی بھرپور کوشش اور سعی پیہم کے ساتھ اللہ کی نصرت و تائید پر کامل بھروسا ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ ہر شخص کی موت کا ایک مقرر وقت ہے جب وہ وقت آجائے تو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا اور جب تک وہ نہ آئے تو اس کو کوئی ہلاک نہیں کر سکتا۔

اور تیسرے یہ اعتقاد کہ اللہ کی راہ میں مرجانا یا کسی طرح کی بھی قربانی پیش کرنا زندگی کا بہترین مصرف ہے۔ جس شخص کے نزدیک اس کے مال و دولت، اولاد اور خود اپنی زندگی اور اپنی ہر خواہش سے زیادہ اللہ کی خوشنودی عزیز تر ہوگی وہ کبھی بزدل نہیں بن سکتا کیونکہ بزدلی صرف اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کے دل میں ان چیزوں کی بے حد اہمیت ہو اور اس کو ان کے زوال کا ڈر ہو۔ اسلام نے خدا کی رضا کے مقابلہ میں دنیا کی ہر چیز کی اہمیت کو باطل کر دیا ہے۔ اس لیئے گویا وہ جڑ ہی نہ رہی جس

بزدلی کی عمارت قائم ہوسکتی ہے۔ اسی کی طرف آیۂ کریمہ کے یہ الفاظ اشارہ کر رہے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ۔ (توبہ - ۱۱۱) اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کو جنت دی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان کی جان اور مال سب خدا کا ہے جس وقت اس کی مرضی ہوگی وہ اسے لے لیگا۔ اس لئے ایک سچے مسلمان کے لیئے بزدلی کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ ایک مشہور روایت میں ہے کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر نماز کے بعد جن چیزوں سے خدا کی بارگاہ میں پناہ مانگا کرتے تھے ان میں سے ایک بزدلی بھی تھی۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ کوئی سچا مؤمن ہو ہی نہیں سکتا جس میں بزدلی پائی جائے۔" غرض قرآن وحدیث کی نظر میں ایک پکا مسلمان کبھی بزدل نہیں ہوسکتا۔ ہم نے اپنے اس دور میں بھی اسلام کی اس عظیم بنیادی تعلیم کے نتیجے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیئے ہیں ہم نے ہمت وجرأت سے کام لیا تھا تو آج ہم دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کے مالک ہیں۔ اگر ہم بزدل بنے رہتے تو بجائے آزادی کی اس نعمت کے غلامی کی زنجیروں میں

جکڑے ہوئے سسک رہے ہوتے اور پھر ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ابھی تھوڑے ہی دن پہلے اگر ہم نے اپنے سرمایہ کی کمی اور اپنے وسائل واسباب اور تعداد کی کمی سے ڈر کر اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور دشمن کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ کیا ہوتا تو آج ہمارا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا اور پہلے سے زیادہ غلامی اور ذلت کے گہرے غار میں ہم کبھی کے دم توڑ چکے ہوتے۔ ہماری پوری تاریخ شجاعت و بہادری کی تاریخ ہے۔ بیشک سچا مسلمان خدا پر بھروسا رکھتا ہے وہ کبھی بزدل نہیں ہو سکتا۔ اور اسی اسلامی جوہر کی بدولت ہم نے اپنے وجود اور اپنی عزت کو ساری دنیا سے منوالیا ہے اور یہی ہمارا امتیاز ہمیں اقوامِ عالم کی صفوں میں ہمیشہ سربلند رکھے گا۔

وقت کی پابندی

وقت کی پابندی نہ کرنے میں صرف اپنا ہی نقصان نہیں ہوتا بلکہ اس کی وجہ سے دوسروں کا بھی نقصان ہوتا ہے اور مجموعی طور پر اس سے پورا انسانی معاشرہ بھی متاثر ہو جاتا ہے مثال کے طور پر ہم نے کسی سے ملاقات کا وقت طے کیا اور پھر اُس مقرر وقت پر ہم اس کے پاس نہ گئے اور بعد میں گئے یا پہلے چلے گئے تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے ضروری کام میں مشغول ہو اور ہمارے وہاں پر بے وقت جانے سے اس کا نقصان ہو پھر ہمارا بلا وجہ انتظار کرنے میں بھی اس کا وقت برباد ہو گا اور وہ کوئی کام نہ کر سکے گا۔ اس کا دوسرا رخ بھی اسی طرح ہے یعنی اگر ہم وقت کی پابندی کریں اور وہ شخص جس سے ہم نے ملاقات کا وقت طے کیا ہے اس کی پروا نہ کرے تو ہمارا جانا بھی بیکار ہو گا اور اس وقت سے ہم کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے اسی طرح تمام انفرادی اور اجتماعی کاموں میں پابندیِ وقت

نہ کرنے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ پھیل کر ہمارے معاشرہ کو گھیر لیتی ہیں اور ہزار ہا اچھائیوں سے فرد کی طرح معاشرہ بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے اکثر و بیشتر کام صرف اسی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں کہ ہم انھیں اُن کے صحیح وقت پر انجام نہیں دیتے۔ اگر ہم اوقات کی سختی کے ساتھ پابندی کریں اور ہر کام کو اس کے صحیح وقت پر انجام دیں تو ہمیں کبھی تنگیِ وقت کا شکار نہ ہونا پڑے یعنی ہم بے اعتدالی کے ساتھ محنت سے بھی بچیں اور ہمارا کام کبھی خراب نہ ہونے پائے۔ اسلام نے مسلمانوں کو پابندیِ وقت کا طرح طرح سے سبق دیا ہے۔ ظاہر ہے عبادتوں میں سب سے زیادہ فضیلت نماز کی ہے جس کا دن رات میں پانچ مرتبہ پڑھنا فرض کیا گیا ہے۔ اس افضل عبادات یعنی نماز کے لیے قرآن حکیم میں اللہ کا فرمان ہے۔ اِنَّ الصَّلوٰۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء/۱۰۳) بلاشبہ مسلمانوں پر معین وقتوں میں نماز کا ادا کرنا فرض کیا گیا ہے" اس لیے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اوقات نماز کی پابندی کرے اسی طرح دوسری عبادتوں کے وقت بھی مقرر کر دیئے گئے ہیں روزہ کا بھی وقت مقرر ہے۔ حج اور زکوٰۃ وغیرہ کا بھی وقت

معین و مقرر رہے۔

اگر ہم غور کریں گے تو ہمیں یہ بات معلوم ہو جائیگی کہ اسلامی عبادات میں ہمیشہ پابندی وقت کا بڑا خیال رکھا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور پابندی وقت میں کوئی اہمیت نہ ہوتی تو پھر کس لئے عبادتوں میں اس پر زور دیا جاتا اور کیوں اس کی تاکید کی جاتی۔

اس سے یہ بات بھی صاف طور پہ سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب اسلام نے عبادتوں میں وقت کی پابندی پر زور دیا ہے تو زندگی کے دوسرے کاموں میں بھی اس کے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہوگی اور ہے بھی ایسا ہی، اس مسئلہ کو اگر ہم ذرا وسعت کے ساتھ دیکھیں تو ہمیں اس کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ وقت کی پابندی نہ کرنے سے ہم صرف اپنا اور دوسروں ہی کا نقصان نہیں کرتے بلکہ ایک اسلامی اور انسانی فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کے ساتھ اللہ کی امانت میں خیانت کرنے کے مجرم بھی بن جاتے ہیں اور وہ اس طرح کہ اس نے کائنات کی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لیے بنائی ہے اور زمانہ اور وقت بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے تاکہ ہم اس سے زندگی کے کاموں میں فائدہ اٹھائیں اور جو وقت جس کام کے لیے بنا ہے اس پر اسے انجام دیں اس لیے

جہاں خدا کی اور نعمتیں ہیں وہاں وقت بھی ایک عظیم نعمت ہے جو صرف ہمارے فائدے ہی کے لیے ہے۔ اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ ہم اللہ کی اس نعمت اور امانت سے پوری دیانت داری اور امانتداری کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور اسے ضائع اور برباد کر کے کفرانِ نعمتِ الٰہی نہ کریں۔ پابندی وقت نہ کرنا درحقیقت خدا کی اس نعمتِ وقت کا برباد کرنا ہے اور اس کی امانت میں خیانت ہے۔ اسلام کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

سورۂ انفال میں مسلمانوں کو کھلے ہوئے لفظوں میں خیانت کرنے سے روکا گیا ہے اس خیانت سے مراد وہ بھی ہے جو مالِ دولت سے متعلق ہو اور وہ خیانت بھی ہے جو اس کے علاوہ دوسری چیزوں سے تعلق رکھتی ہو اور جسے کسی حیثیت سے بھی خیانت کہا جا سکتا ہو۔ خدا کا ارشاد ہے۔ یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انفال ۲۷)

ایمان والو تم خدا اور رسول کی امانت میں خیانت نہ کرو اور نہ (اور) امانتوں میں خیانت کیا کرو حالانکہ تم جانتے ہو، بلاشبہ وقت بھی اللہ کی نعمت اور امانت ہے اور اسے ضائع و برباد کر دینا اور اس کی پابندی نہ کرنا خیانت ہے۔ پھر جب اس "وقت" کا تعلق خدا

کے بندوں سے بھی ہو جائے تو یہ اُن کی بھی امانت بن جائے گا اور اس طرح اس کے بے جا صرف اور اسکی پابندی نہ کرنے سے خدا کی امانت میں بھی خیانت ہوگی۔

مثال کے طور پر کوئی شخص کسی ادارہ یا کسی فرد کا ملازم ہے یا اسی قسم کی پابندی کسی اور وجہ سے اُس پر عائد ہو جاتی ہے تو ایسی حالت میں یہاں دُہری امانتداری کا فرض پیدا ہوگا۔ ایک فرض اللہ کی طرف سے اور دوسرا اس کے بندوں کی طرف سے۔ اور اگر اس "وقت" کا غلط استعمال کیا گیا یا اس کی پابندی کا خیال نہ رکھا گیا تو یہ خدا کی ایک امانت میں خیانت کے ساتھ ساتھ بندوں کی امانت میں بھی خیانت ہوگی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے حضرت ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی تھی: اس سے قبل کہ تمہارے پاس وقت باقی نہ رہے اپنی فرصت کے وقت کو غنیمت سمجھو فَاِنَّکَ لَا تَدْرِیْ مَا اسْمُکَ غَدًا۔ کیونکہ تمہارے پاس تو بس آج ہی کا دن ہے اور کل آنے والا دن تمہارا نہیں ہے۔ پھر اگر کل کا دن تمہارے لئے نہ آیا یا تم اس میں کوئی کام نہ کرسکے تو تمہیں گئے ہوئے دن پر افسوس اور شرمندگی نہ ہوگی۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو کسی دوسرے دن کا انتظار کرتے ہیں۔ مگر انتظار نہیں

کوئی فائدہ نہیں دیا اور نتیجہ میں آئندہ بھی ان کے لیئے خسارہ ہی ہوتا ہے اور پچھلا وقت بھی اُن کی غفلت کی نذر ہو جاتا ہے غرض وقت انسان کے لیئے بے انتہا قیمتی چیز ہے اور اگر وہ اس کی قدر کرے اور اس کا جائز اور صحیح استعمال کرے تو کبھی اسے نقصان نہ اٹھانا پڑے - وقت ہمارا سب سے بڑا دوست ہے، اور ساتھ ہی سب سے زیادہ خطرناک دشمن بھی - اگر ہم اس کی قدر کریں گے یعنی جو کام بھی کرنا ہو اسے بالکل صحیح وقت پر اور پوری پابندی سے انجام دیں گے تو وہ بھی اپنی دوستی کا پورا حق ادا کرے گا اور جس قدر فائدہ بھی ممکن ہے ہم کو پہنچے گا - لیکن اگر ہم وقت کی ناقدری کریں گے تو پھر وہ بھی مصیبتوں کا پہاڑ بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہو جائے گا اور ہماری تباہی و بربادی کا ذریعہ بن جائے گا - وقت کا برباد کرنا یہ ہے کہ اس کی پابندی نہ کی جائے - کائنات کا پورا انتظام وقت کا پابند رہے - چاند سورج، ستارے، سردی گرمی اور تمام فصلیں زمانہ اور وقت کی پابند ہیں - ستارے اور سیّارے ایک مقررہ نظام کے تحت ایک معین وقت پر نکلتے ہیں اور غروب ہو جاتے ہیں اور اسی طرح کائنات کی ہر چیز کا حال ہے - قرآن حکیم نے "اَجَلٍ مُّسَمًّی" کا بار بار ذکر کیا ہے جس کے

معنی مقرر و معین وقت کے ہیں۔ سورۂ رعد میں ہے:
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى۔ یعنی اللہ نے سورج اور چاند کو اپنا تابعدار بنایا ہے جس میں سے ہر ایک مقرر وقت تک چلا کرتا ہے۔ غرض اللہ نے کائنات کے مزاج میں پابندیٔ وقت کو داخل کیا ہے تو کیا وہ انسان کے لئے نہ چاہے گا کہ وہ وقت کی پابندی کرے جسے اس نے تمام مخلوقات سے افضل بنایا ہے۔ بلاشبہ انسان کی ذمہ داری وقت کی قدر اور پابندی کرنے کے متعلق تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ ہے۔

قول و عمل میں یکسانیت

انسان کی اجتماعی زندگی کی بہتری کے لئے بنیادی حیثیت سے جن باتوں کی ضرورت ہے ان میں قول اور عمل کی مطابقت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس کے بغیر ایک کو دوسرے پر کبھی اعتبار اور اعتماد نہیں ہو سکتا اور اس طرح لین دین، عہد و قرار اور دوسرے باہمی امور میں جن سے انسان کی اجتماعی زندگی کا گہرا تعلق ہے ہمیشہ ابتری اور افراتفری رہے گی اور اس آپس کی بے اعتباری کی وجہ سے ترقی کی ساری راہیں اس کے لیئے بند ہو جائیں گی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے نتیجہ میں پورے معاشرہ کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے گا۔

قول و عمل میں اتحاد اور یکسانیت جس طرح ہمارے آپس کے معاملوں میں ضروری ہے اور بغیر اس کے ہم نہ تو اپنی اس دنیاوی زندگی کو کامیاب بنا سکتے ہیں اور نہ باقی ہی رکھ سکتے ہیں اسی طرح ان معاملات میں بھی ضروری ہے جو ہمارے اور خدا کے درمیان ہیں

اسکا مطلب یہ ہوا کہ جن باتوں کا ہم خدا کی بارگاہ میں زبان سے اقرار کرتے ہیں اُن پر ہمیں اپنے اقرار کے مطابق عمل بھی کرنا چاہیئے۔ ہم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور محمد رسول اللّٰہ کہکر خدا کی وحدانیت اور خاتم المرسلین صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں تو ہمیں اپنے عمل سے بھی اس اقرار کی تصدیق کرنا چاہیئے۔ یعنی ہم ہر اس بات کو جو خدا اور رسول کی مرضی اور حکم کے خلاف ہو نہ کریں اور وہی کریں جس کا ہمیں اُدھر سے حکم ملا ہو اور اس کی اجازت حاصل ہو۔

قرآن کریم میں ان لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جن کے قول و فعل میں ہم آہنگی اور مطابقت نہیں پائی جاتی۔ سورہ الصف آیہ ۲/۳ میں ارشاد ہوا ہے یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کَ... وَاللّٰہُ یَشْہَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ "اے ایمان والو تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک یہ بڑی بیزاری کی بات ہے کہ تم جو کچھ (زبان سے) کہو اس پر عمل نہ کرو۔" اس ارشاد خداوندی سے یہ حقیقت بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کے نزدیک قول و فعل کی مطابقت کسقدر اہم اور ضروری ہے، اور یہ کہ قول و عمل میں یکسانیت نہ ہونا خدا کی ناراضی کا سبب ہوتا ہے اس لیئے ہر مسلمان کے لیئے لازم ہے کہ وہ جو کچھ زبان سے کہے اسکے مطابق عمل

بھی کرے تاکہ اُسے خدا کی خوشنودی حاصل ہو اور وہ دنیا و آخرت کی کامیابیاں پانے کا مستحق ہو سکے۔ قول و عمل میں مطابقت کی صفت انسان کو بہت سی برائیوں اور خرابیوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ یقیناً جو شخص اس عادت کو اختیار کر لیگا وہ کبھی جھوٹ نہ بولے گا، وہ پوری کوشش کرے گا کہ ہر برائی سے بچے تاکہ دوسروں کے سامنے صحیح بات بیان کرنے میں اس کو کبھی شرم و ندامت یا خوف نہ پیدا ہو۔ ایسا آدمی قطعی طور پر سچا ہو گا اُس سے کسی قسم کی غداری اور مکاری کا کوئی خطرہ کسی کو نہ ہو گا ایسا شخص وعدہ کا پکّا اور عہد کا دھنی ہو گا اُس کے دل میں کبھی نفاق نہیں آسکتا "پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اور" اُس کی شان نہ ہوگی، وہ کبھی کسی کی خوشامد اور چاپلوسی نہیں کرے گا اور ہر شخص اس پر بھروسا کرے گا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے: جس آدمی میں چار باتیں ہیں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان چار باتوں میں سے ایک ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے۔ (وہ باتیں یہ ہیں) جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے ۲ جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے ۳ جب کوئی اقرار کرے تو اس کو پورا نہ کرے ۴ جب جھگڑا کرے تو حق کے

خلاف کہے۔ اس ارشادِ نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ قول وعمل کا باہم مطابق نہ ہونا نفاق کی علامت ہے اور یہ اس سچائی کے خلاف ہے جس پر اسلامی سیرت وکردار کی تعمیر موقوف ہے۔ قرآنِ کریم میں جہاں منافقوں کا ذکر ہے وہاں اُن کے اس اقرار کو کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا سچّا رسول جانتے ہیں، غلط اور خود اُن کو جھوٹا فرمایا گیا ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (سورۂ منافقون آیۃ ۱) اور خدا اس کی گواہی دیتا ہے کہ منافق (اپنے اس اقرارِ رسالت میں) جھوٹے ہیں۔

حالانکہ جو بات منافقوں نے کہی وہ خود اپنی جگہ پر بالکل دُرست اور حق تھی، یعنی سرورِ انبیاء کی رسالت مگر چونکہ ان کا یہ قول ان کے اعتقاد اور عمل کے خلاف تھا کیونکہ وہ آنحضرتؐ کی رسالت کے منکر تھے اس بنا پر انھیں جھوٹا کہا گیا اور اُن کے منافق ہونے کے ثبوت میں اُن کی اس بُرائی کا اظہار فرمایا گیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ قول وفعل کی مطابقت سچے ایمان کی علامت اور خوشنودیِ خدا کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے اور ان دونوں باتوں کا فرق نفاق کی نشانی اور غضبِ الٰہی کے نزول کا سبب بنتا ہے۔

جہاں قول و عمل کی مطابقت انسانی معاشرہ کی فلاح کے لیئے ایک
بہت اہم بنیاد ہے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ خود قول یعنی جو بات
کہی جائے وہ بھی ایسی نہ ہو جو برائی پر مشتمل اور سچائی کے خلاف
ہو اور عمل بھی پوری طرح درست اور صحیح ہو ورنہ اگر قول و عمل خود
ہی غلط ہوں اور حکم خدا کے خلاف اور اُس کی ناراضی کا سبب ہوں
تو ان میں یکسانیت کا ہونا اور نہ ہونا سب برابر ہے۔ اس لیئے
سچا مسلمان بننے کے لیئے سب سے بیشتر یہ ضروری ہے کہ اپنے عمل
کو مرضی الٰہی کے تابع کیا جائے اور ہمارا کوئی عمل ایسا نہ ہو جس سے
ہم خدا کے غضب اور اس کی ناراضی کے مستحق بن جائیں۔ اس کے
بعد پھر جو کچھ ہماری زبان سے نکلے اُس میں بھی جھوٹ نہ ہو، نفاق
نہ ہو، فریب نہ ہو اور کوئی ایسی بات نہ ہو جسے خدا نے منع کیا ہے۔
مختصر یہ کہ خود بات بھی سچی ہو، عمل بھی درست ہو اور ان دونوں
میں مطابقت اور ہم آہنگی بھی ہو تو پھر انسان کے لئے ہر نیکی کے
حصول کا راستہ آسان ہے۔ اسلام کے نزدیک قول و عمل میں یکسانیت
کی اہمیت کا اس روایت سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے جو عبداللہ
بن عامر بن ربیعہ سے منقول ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ
سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے

اس وقت میں بہت کم سن تھا۔ میں کھیلنے کے لیے جانے لگا تو میری والدہ نے مجھے آواز دیکر بلایا اور کہا کہ اِدھر آ تو میں تجھے کچھ دوں۔

آنحضرتؐ نے میری والدہ کی اس آواز کو سن لیا اور فرمایا کہ تم اس بچّہ کو واقعی کوئی چیز دینا چاہتی ہو۔ انھوں نے عرض کی بیشک حضور! میں اس کو کچھ کھجوریں دونگی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر تمہارا کچھ نہ دینے کا ارادہ ہوتا اور اس طرح کہتیں تو تم پر ایک جھوٹ لکھا جاتا"۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قول و عمل کی مطابقت کا کیا درجہ ہے۔

انسؓ بن نضرؓ کو جنگ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا تو انھوں نے کہا کہ اگر اب مجھ کو کسی غزوہ میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تو اپنی شجاعت کے جوہر دکھاؤں گا۔ چنانچہ انہیں جنگ احدؐ میں شرکت کا موقع حاصل ہوا تو انہوں نے نیزہ، تیر اور تلوار کے تقریباً اسّی زخم کھا کر شہادت کی عزت حاصل کی۔

غرض سچا مسلمان وہی ہے جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کے دل کا ہر ارادہ اور اس کے عمل کی ہر مثال حق، سچائی اور اطاعتِ خدا و رسولؐ کا مظہر ہو اور اس کے قول و فعل میں دو رنگی اور اختلاف نہ ہو۔ قرآنِ حکیم کا اعلان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ

"نیکی یہی نہیں ہے کہ نماز میں اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لیا جائے بلکہ نیکی تو اس کی ہے جو خدا اور روز قیامت، ملائکہ، خدا کی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور خدا کی محبت میں اپنا مال قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں، پردیسیوں، مانگنے والوں اور ان لوگوں کو آزاد کرانے میں جو غلامی کی قید میں ہوں، صرف کرے اور جو پابندی سے نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے اور جب وہ کوئی عہد کرے تو اسے پورا کرے اور فقر و فاقہ، رنج، سختی اور کٹھن کے وقت ثابت قدم رہے۔ یہی لوگ ایمان میں سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔ (البقرہ آیہ/۱۷۷)

یہ سب آیات و احادیث صاف طریقہ پر ہمیں ہدایت کر رہی ہیں کہ ہمارے ہر قول و عمل اور ہر ارادہ اور نیت کی بنیاد حق و صداقت پر ہونا ضروری ہے اور پھر ان میں یکسانیت اور ہم آہنگی بھی حقیقی اسلام اور ایمان کی اہم ترین شرط ہے اور کامل مؤمن وہی ہے جس کی زبان اور عمل میں اختلاف نہ ہو، اور دونوں میں پوری یکسانیت پائی جائے۔

———

اجتماعی ذمّہ داریاں

اسلام نے اجتماعی ذمّہ داریوں کو جتنی اہمیت دی ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اُس نے انھیں بڑی حد تک اپنے دینی اور روحانی نظام کا جزو بنا دیا ہے۔ دوسرے مذاہب اور قوموں نے بھی اجتماعی ذمّہ داریوں کو اپنے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے مگر کسی جگہ بھی ہمیں اجتماعی ذمّہ داریوں کا وہ تصوّر اور وہ تفصیل اور اہمیت نہیں ملتی جو اسلام میں پائی جاتی ہے۔

درحقیقت ان ذمہ داریوں کو سمجھنے اور انھیں پورا کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ انسان فطری طور پر مدنی الطبع ہے یعنی بغیر میل جول کی زندگی اختیار کیئے نہ تو وہ باقی رہ سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے۔ یہی میل جول کی زندگی ہے جو تمام اجتماعی ذمّہ داریوں کے پیدا ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیئے کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب چند آدمی ایک جگہ

جمع ہوں گے تو ایک کی ضرورت دوسرے سے وابستہ ہوگی اور طرح طرح کی ذمہ داریاں ظہور میں آئیں گی۔ رہنا سہنا، شادی بیاہ، تعلیم و تربیت، بیماری، موت، وراثت، ملکیت، صنعت و حرفت، زراعت، خرید و فروخت اور اسی طرح کی سیکڑوں باتیں ہیں جن میں کبھی بغیر باہمی تعاون کے زندگی نہیں گزاری جا سکتی اور ہمیشہ ایک کو دوسرے کی احتیاج اور ضرورت رہا کرتی ہے۔ یہ میل جول کی زندگی جس پر انسانی معاشرہ کا وجود موقوف ہے فطری طور پر یہ چاہتی ہے کہ ہر فرد دوسرے کے متعلق اپنی ذمہ داری اور فرض کو پورا کرے لیکن کسی ذمہ داری کا تصوّر تو اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم خود انسانی زندگی کی اہمیت کو سمجھ سکیں اس بنا پر ہر ذمہ داری سے پہلے ہماری پہلی اور سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم انسانی زندگی کا احترام کریں کیونکہ جب تک اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی اور وہ قابل احترام نہ قرار دی جائے گی اس وقت تک کسی طرح کی بھی اس کے متعلق ذمہ داری کے پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مکّہ میں ظہور اسلام سے پہلے انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ معمولی جانوروں اور بے

حقیقت چیزوں پر قبیلوں میں لڑائیاں شروع ہو کر برسوں جاری رہتی تھیں اور انسانوں کا قیمتی خون پانی کی طرح بہنا رہتا تھا - نو مولود لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم عام تھی غرض اسی طرح ہر طرف انسانی حیات کے ساتھ جو ظلم و تشدد جاری تھا اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی کوئی قدر اور اہمیت اُس وقت کے انسانی ذہن میں موجود نہ تھی۔

اسلام نے پہلی بار اُن کو بتایا کہ ساری کائنات میں انسان کا درجہ کس قدر بلند ہے -

انسانِ کامل زمین پر خدا کا خلیفہ ہے اور پوری کائنات اُس کے لئے مسخر کر دی گئی ہے - ۵

نہ تو زمیں کیلئے ہے نہ آسماں کے لیئے
جہاں ہے تیرے لیئے تو نہیں جہاں کے لیئے

قرآن کریم نے اس کا اعلان کیا "اَنَّہٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا" (المائدۃ ۳۲) جو شخص کسی کو نہ جان کے بدلہ میں نہ ملک میں فساد پھیلانے کی سزا میں (بلکہ ناحق) قتل کر ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا

اور جس نے ایک آدمی کو جلا لیا تو گویا اس نے سب کو جلا لیا اور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری حج کے موقع پر فرمایا تھا: تمہارے خون ایک دوسرے پر ویسے ہی قابل احترام ہیں جیسے خود سرزمین مکہ محترم ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام نے انسانی زندگی کی حرمت اور قدر و منزلت کو جس طرح بتایا ہے، اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ انسانی زندگی کے اس احترام ہی کی وجہ سے ہر انسان کی دوسرے انسان کے متعلق ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے، اس کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آئے، اس کی ترقی میں رکاوٹ نہ بنے اس کی امانت میں خیانت نہ کرے، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتا رہے، آپس میں اخوت اور محبت سے زندگی بسر کرے اور اسکے تمام جائز حقوق کا پاس و لحاظ کرے، باہمی تمام معاملوں میں پوری دیانت اور سچائی کا پابند رہے، کوئی شخص کسی کو دھوکا نہ دے اور ہر فرد اپنی جائز خواہشات کو جائز حدود میں رہ کر پورا کرنے کے لیئے آزاد ہو۔

ان تمام ذمہ داریوں کی تقسیم ہم تین مرحلوں میں کر سکتے ہیں۔
وہ ذمہ داریاں جو گھر والوں سے متعلق ہوں، وہ جو محلہ، شہر اور ایک

ملک اور ایک خطہ سے تعلق رکھتی ہوں اور وہ ذمہ داریاں جو پورے انسانی معاشرہ سے وابستہ ہوں۔ گھر کی ذمہ داریوں میں ماں باپ، اولاد، شوہر یا زوجہ اور قریبی رشتہ داروں اور خاندان والوں کے متعلق پیدا ہونے والی تمام ذمہ داریاں شامل ہیں۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو تفصیلی حکم دیئے ہیں ان کو دیکھ کر اجتماعی زندگی کے اس پہلے ہی مرحلہ پر سچے مسلمان کو اپنی ان تمام ذمہ داریوں کا پورا احساس ہو جاتا ہے جو اجتماعی زندگی کے کسی شعبہ سے بھی تعلق رکھتی ہوں۔

اس پہلے مرحلہ میں ماں باپ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، قرابت داروں کا جائز حدود میں رہ کر پاس و لحاظ کرنے اور ان کی ہر ممکن مدد کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے حق بتائے گئے ہیں۔ گھر والوں کے متعلق تمام ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیئے قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (سورۃ التحریم آیہ/۶)

اے ایمان والو تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔" اس آگ سے مراد نارِ جہنم ہے اور مقصود یہ ہے کہ ان تمام برائیوں اور خرابیوں سے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو بچایا جائے جو

دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں۔

اس فرمانِ الٰہی کی وسعت میں وہ تمام ذمّہ داریاں حقوق اور فرائض آجاتے ہیں جن کا تعلق تدبیرِ منزل یعنی انسان کی گریلو زندگی سے ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے انتہائی جامع طریقہ پر لوگوں کو اُن ذمّہ داریوں سے اس طرح آگاہ فرمایا ہے۔ خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ (الحدیث) یعنی تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بہترین برتاؤ کرتا ہو اور اُن کے لیئے بہترین شخص ثابت ہو۔

اولاد سے متعلق ذمہ داریوں کے لیئے حدیث میں ہے:
اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ وَ اَحْسِنُوْا آدَابَھُمْ فَاِنَّ اَوْلَادَکُمْ ھَدِیَّۃٌ اِلَیْکُمْ۔
اپنی اولاد کی قدر کرو اور انھیں اچھی عادتیں اور اچھّے طور طریقے سکھاؤ۔ کیونکہ تمہاری اولاد تمہارے لیئے (اللہ کا) تحفہ ہے گھر والوں کے بعد ہمسایہ کے حقوق سمجھائے گئے ہیں اور حدیث میں یہاں تک تاکید ہے کہ جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسُول اس سے محبّت کرے اس کو چاہیئے کہ وہ اپنے پڑوسی کے حق ادا کرے۔"

اجتماعی زندگی کے اس پہلے مرحلہ کے بعد پھر معاشرہ ہے

متعلق دوسری ذمہ داریاں سامنے آتی ہیں۔ وہ جو ہم عقیدہ لوگوں سے متعلق ہیں، یا ایک شہر، خطّہ اور ایک ملک کے بسنے والوں سے متعلق ہوتی ہیں یا انسانی معاشرہ کے عام افراد سے تعلق رکھتی ہیں۔

ان سب میں پہلی بنیادی بات تو یہی ہے کہ ایک دوسرے کی زندگی کا احترام کرے اور زندہ رہنے اور ترقی حاصل کرنے کے جائز حقوق میں اپنے صحیح حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اس کے بعد پھر ہر فرد پر وہ تمام ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں جو حیاتِ اجتماعی کی بقا اور بہبود کے لیئے ضروری ہیں۔ اس سلسلہ میں ہر شخص پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دوسرے پر ظلم نہ کرے اور اسکی اذیت کا سبب نہ بنے پیغمبرِ اسلام کا ارشاد ہے: مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔" ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے: ایمان والوں کی مثال آپس کی محبّت اور دوستی میں ایک بدن کی سی ہے کہ جب اُسکا ایک عضو تکلیف میں ہو تو سارا بدن اور تمام اعضا اس تکلیف کا احساس کرتے ہیں۔" اس بنا پر ہر شخص پر یہ اجتماعی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ امن و امان کو برقرار رکھے اور کوئی کام ایسا نہ کرے یا کوئی ایسی بات مُنہ سے نہ نکالے جو آپس کی محبّت اور باہمی اتحاد و اتفاق کے خلاف ہو۔ اسلام نے باہمی میل جول اور اتفاق و اتحاد پر اسلیئے بے انتہا زور دیا ہے کہ

رشتۂ اتحاد جتنا قوی تر اور مضبوط تر ہوگا اسی کے مطابق اجتماعی زندگی کی دوسری ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا جذبہ بھی تیز تر ہوتا جائے گا۔ اسی وجہ سے حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "مَنْ فَرَّقَ فَلَيْسَ مِنَّا" "جو شخص آپس میں پھوٹ ڈالے اور انتشار پیدا کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔ اور اسی لیئے یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ "جو ہمیں دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔ غرض آپس کی محبت اور خلوص معاشرہ کے ہر فرد کی ایک اہم اجتماعی ذمہ داری ہے جسکو پورا کرنا اُس کا فرض ہے۔ اب جہاں تک انسانی معاشرہ کے عام افراد کا تعلق ہے ان کے متعلق بھی ہر ایک کی وہ ساری ذمہ داریاں ہوں گی جو انسانی زندگی کے احترام کو تسلیم کر لینے کے بعد پیدا ہونا ممکن ہیں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے سرورِ دو عالم کا یہ ارشاد اس حقیقت کو سمجھنے کے لیئے کافی ہے: اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللّٰهِ وَاَحَبُّهُمْ اِلَى اللّٰهِ اَنْفَعُهُمْ لِعِيَالِهِ (الطبرانی) خدا کی ساری مخلوق (گویا) اس کا کنبہ ہے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اُس کے اس کنبہ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے"۔

اسمگلنگ اسلام کی نظر میں

اسلامی نقطۂ نظر سے تمام چیزوں کی لین دین کوئی ایک فرد کرے یا کئی آدمی مل جل کر۔ ایک گھر میں ہو، ایک شہر میں ہو، ایک ملک میں ہو یا ملک کے باہر بھی اس کا سلسلہ ہو کسی طرح سے بھی ہو مگر اس کی بنیاد جائز اور صحیح ہونا چاہیئے۔ کسی کے حق پر ناجائز قبضہ نہ ہو، دھوکا۔ فریب عہد و قرار کی خلاف ورزی، چوری، بددیانتی، بے ایمانی، رشوت، جھوٹ ظلم غرض ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے انسانی کردار پر دھبّا لگتا ہو اور خدا اور رسولؐ کے احکام کی تعمیل میں فرق آسکتا ہو۔ قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایک مختصر جملہ میں واضح کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (النساء/۲۹) اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقہ پر نہ کھاؤ۔ صرف ایک لفظ "باطل" کہہ کر قرآن کریم نے آپس کے تمام مالی معاملات میں ان تمام دروازوں کو بند کر دیا ہے جن میں کسی صورت سے بھی بے ایمانی کا پہلو نکلتا ہو اس طرح جس ناجائز طریقہ سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے گا اس لفظ کے وسیع دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا "اسمگلنگ" کافی مشہور

لفظ ہے جس سے مراد ہے چیزوں کی خلاف قانون طریقہ پر درآمد و برآمد کرنا۔ اس طرح یہ ملکی قوانین سے بچ کر چھپے چوری اشیاء کو اِدھر اُدھر منتقل کرنا کہلاتا ہے ۔ اس عمل میں اسلامی نظریہ کے تحت بہت سی بُری باتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن میں سے اگر صرف ایک برائی بھی ہوتی تو اس کے غیر اسلامی ہونے کے لیئے کافی تھی ۔ مثال کے طور پر اس کام سے جھوٹ بولنے کی عادت پڑتی ہے بلکہ بغیر جھوٹ بولے اس میں کام ہی نہیں چل سکتا ۔ اگر کوئی سچ بولتا ہے اور ٹھیک ٹھیک باتیں بتادے تو سارے خطرے اس کے سامنے فوراً کھڑے ہو جائیں گے ۔ اس لیئے وہ لازمی طور پر جھوٹ بولے گا اس کے بعد یہ امر بالکل صاف ہے کہ جس عمل کی بنیاد ہی جھوٹ بولنے پر ہو وہ کس طرح اسلامی نظریہ کے تحت جائز ہو سکتا ہے ۔ اسلامی زندگی کا بنیادی اصول صدق یعنی سچائی ہے جس سے اسمگلنگ کو دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا ۔ خدا نے قرآن کریم میں جابجا جھوٹ بولنے والوں پر لعنت فرمائی ہے اس لیئے ایسا کام اور ایسی تجارت بھی قابل لعنت ہوگی جس کے ذریعہ سے اسلام کا بنیادی نظریہ "سچائی" سرے ہی سے ختم ہو جاتا ہے اور جس میں ایک جھوٹ نہیں بلکہ سیکڑوں جھوٹ بولنا پڑیں ۔ اسمگلنگ کرنے والا اس عہد و قرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے جو اس نے جائز طور پر ملکی انتظامیہ سے

کیا ہے۔ اسلام کا حکم یہ ہے کہ جب عہد کرو تو اسے پورا کرو۔ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ (بنی اسرائیل/۳۴) معاہدہ کو پورا کیا کرو۔ قوانین کی پابندی کا جو عہد کسی نے کیا ہے اسمگلنگ کی صورت میں کسی طرح باقی نہیں رہ سکتا اور جھوٹ بولنے کے ساتھ عہد و قرار سے غداری اور اس کی خلاف ورزی کرنے کا غیر اسلامی طریقہ بھی اس میں ضروری ہے اس عمل یعنی اسمگلنگ کی ایک بڑی بنیاد حرص اور لالچ ہے اس کام کے کرنے والے کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی ترکیب سے زیادہ سے زیادہ نفع خوری کر سکے اور زیادہ سے زیادہ دولت کمائے۔ ظاہر ہے کہ اسلام حرص و طمع کی ترغیب نہیں دیتا۔ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾ تغابن/۱۶) جو لوگ اپنی طبیعت کی حرص اور لالچ سے بچا لیے گئے وہی کامیاب ہیں" خدا کی نظر میں اصلی کامیابی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان کے عمل میں لالچ اور حرص کا جذبہ موجود نہ ہو تو پھر اسمگلنگ کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے اس بنا پر یہ عمل اس نقطۂ نظر سے بھی غیر اسلامی ہے۔ اسمگلنگ بغیر رشوت ستانی کے نہیں ہوتی جو لینے اور دینے والوں کے لیے ہر صورت اور ہر شکل میں حرام ہے اور صرف ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ رشوت ستانی کا جرم اس میں قدم قدم پر کرنا پڑے گا اس لیے ایسا کام جو رشوت لینے اور دینے کا سبب بنے قطعاً حرام اور غیر اسلامی ہے۔

اسی طرح اس سے بے حیائی کی بھی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ انسان کو اپنی عزت اور آبرو کا پاس نہیں رہتا اور وہ ان کو خطرہ میں ڈال کر اسمگلنگ کا کام کرتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی سزا کیا ہے اور اُسے اور اُس کے ساتھیوں اور مدد کرنے والوں کو کن خطروں کو برداشت کرنا پڑے گا اور سزا کی صورت میں کتنی تکلیفیں اور بے عزتی اٹھانا پڑے گی اس لیے ایسا عمل جس سے انسان کی عزت و آبرو اور زندگی تک خطرہ میں پڑ جائے وہ اسلام کی نظر میں کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ اس تھوڑی سی تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اسمگلنگ ایسا عمل ہے جس کی تہ میں بے شمار برائیاں چھپی ہوئی ہیں جو صرف ایک فرد یا ایک گروہ تک محدود نہیں رہتیں بلکہ پورا معاشرہ اُس سے متاثر ہوتا ہے اور یہ واحد جرم متعدد سنگین جرائم کا مجموعہ ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی اور سماجی کردار کی جڑیں کٹتی ہیں، اس سے دھوکا دینے کی عادت اور چوری کرنے کی خواہش اور جذبہ کو مدد ملتی ہے اس سے رشوت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ عزّت و آبرو تباہی میں پڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ اسمگل کیا ہوا مال کتنے جرائم کے ارتکاب کے بعد ہمارے ہاتھ میں آتا ہے تو ظاہر ہے کہ شرعی طور پر اس کا صرف کرنا، اس کا خریدنا اور

کسی صورت سے بھی اس کو استعمال کرنا ہمارے لیئے جائز نہ ہو گا اور اس کا شرعی حکم وہی ہو گا جو دوسری حرام کمائیوں اور حرام ذریعوں سے حاصل کی ہوئی اشیاء کا ہوتا ہے۔ ایک سچے مسلمان کی ذمہ داریاں جو اپنی زندگی کو قرآن اور سنت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے اور اسی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہو جس طرح اس کا دین اور اس کا اللہ اسے سکھاتا ہے، بڑی اہم ہیں ورنہ پھر مسلمانوں اور دوسروں کی زندگیوں میں فرق ہی کیا ہو گا۔ مسلمان کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ہر عمل میں خدا کی مرضی اور اس کے حکم کو مقدم رکھے اور سچائی کے ساتھ حق کی پیروی کرے۔ اگر کسی بھی عمل کی بنیاد خدا کے حکم سے سرکشی پر ہے خواہ اس عمل کا تعلق انسان کی زندگی کے کسی شعبہ سے کیوں نہ ہو تو وہ عمل غیر اسلامی ہو گا۔ اسمگلنگ کی بنیاد اللہ کے حکم سے سرکشی پر ہے۔ جبکہ اس مجموعہ کے ہر ہر جزو کو الگ کیا جائے تو اس میں سے جرائم اور برائیوں کی ایک لمبی فہرست نکلے گی۔ اس لیئے اسمگلنگ اسلامی نقطۂ نظر کے تحت گناہ ہے، جرم ہے، معصیت ہے اور اس ذریعہ سے کمائی ہوئی دولت بھی ناجائز ہے۔ اور وہ تمام اشیاء جو اسمگل کر کے لائی گئی ہوں ان کا استعمال بھی کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ان اشیاء کی حیثیت بھی وہی ہو گی جو چوری کے اور غصبی مال کی ہوتی

ہے۔ اس لیئے ان کا استعمال کسی طرح سے بھی ہو غیر شرعی ہو گا۔ عبادتیں بھی ایسے لباس میں قطعاً باطل ہوں گی۔ جب کہ یہ طے شدہ ہے کہ یہ عمل بُرا ہے تو یقیناً یہ " فحشاء " کے مفہوم میں داخل ہے اور قرآنِ کریم کا اعلان ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ (اعراف/۳۳) اے رسولؐ کہدو کہ میرے اللہ نے " فواحش " یعنی بُرائی کے تمام کاموں کو جو کھلے ہوئے ہوں یا چھپے ہوئے ہوں نیز گناہ اور ناحق زیادتی کو حرام کر دیا ہے "۔

اسمگلنگ بھی فواحش میں داخل ہے اور " اِثْم " و " بَغْی " کے مفہوم کا پوری طرح اس پر اطلاق ہوتا ہے اس لیئے یہ قطعاً حرام ہے اور اس کے ذریعہ سے حاصل کی ہوئی اشیاء کا ہر طور پر استعمال شریعت کے خلاف ہے۔

حقوق اللہ و حقوق العباد

اسلام کی بنیادی اور اہم ترین تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دو قسم کے حق ہوتے ہیں ایک وہ جو اس پر اس کے خالق کی طرف سے عائد ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو مخلوق کی طرف سے ۔ یعنی کچھ حقوق اللہ ہیں اور کچھ حقوق العباد ہیں ۔ ان ہی دونوں قسموں کے حقوق سے آگاہی حاصل کرنا اور انھیں انجام دینا اسلامی نظامِ زندگی کہا جاتا ہے اور ایک سچا اور حقیقی مسلمان وہی ہو سکتا ہے جو ان سے باخبر ہو اور انھیں ادا کرے ۔ پھر یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ یہی حقوق جہاں ایک فریق کے لیئے ایک حق کی حیثیت رکھتے ہیں ساتھ ہی دوسرے فریق کے لیئے اس کا فرض بن جاتے ہیں مثال کے طور پر ایک بے سہارا اور اپاہج آدمی کا حق ہے کہ دوسرے لوگ جو خوشحال ہوں اس کی امداد کریں تو اس امداد کا ملنا اس غریب آدمی کا حق ہو گیا اور اس امداد کا دینا خوشحال

لوگوں کا کبھی اخلاقی اور کبھی شرعی فرض ہو گیا۔ غرض ان حقوق کا تعلق اللہ کی ذات سے لیکر اُس کی ادنیٰ ترین مخلوق تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب انسان کو زندگی ملتی ہے تو اس کا سب سے پہلا تعلق اپنے خالق ہی سے ہوتا ہے اور اس کی جانب سے اس پہ کچھ ذمہ داریاں آجاتی ہیں۔ اور بحیثیت ایک اپنی مخلوق کے اللہ پہ اس کے بھی کچھ حقوق ہو جاتے ہیں کہ وہ اسے عقل عطا کرے، قوت و طاقت دے اور زندہ رہنے کے جو بھی ضروری اسباب اور وسائل ہو سکتے ہیں سب عطا فرمائے۔ اس کے ساتھ ہی اس پیدا ہونے والے انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ یہ اپنے اللہ کی مرضی پہ چلے اُس کی اطاعت کرے اور اُس کی مخلوق کے بھی حق ادا کرے۔ ان تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پوری تفصیل اللہ نے ہمیں اپنے پیغمبروں اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے بتا دی ہے اور اسی غرض سے تمام پیغمبر بھیجے گئے تھے کہ وہ ہمیں ان حقوق اور فرائض سے آگاہ کر دیں۔

ان تمام ذمہ داریوں، فرائض اور حقوق میں اس قدر وسعت ہے کہ یہ صرف کائنات کی دوسری چیزوں ہی سے نہیں بلکہ خود انسان کی اپنی ذات سے بھی متعلق ہوتے ہیں۔ یعنی جہاں ہر انسان پر دوسروں کے حق ہوتے ہیں خود اپنی ذات کے بھی حقوق ہیں جن کو پورا کرنا اس کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: فَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا۔ بے شک تمہاری اپنی جان کا بھی تم پر حق ہے کہ تم اس کی حفاظت کرو اور اس کی جائز ضروریات کو پورا کرتے رہو۔ فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا۔ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے۔ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا۔ تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے اور اسی طرح وَلِزَوْرِکَ عَلَیْکَ حَقًّا۔ تم سے ملاقات کرنے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ وَلِاَھْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا۔ اور تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ یہی حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حدود اللہ کہلاتے ہیں جن کا بار بار قرآن حکیم میں ذکر آتا رہتا ہے اور ان کا پورا کرنا ہر سچے مسلمان کا فرض ہے۔

غرض نوع انسان کی ہر صنف کے لوگوں کے لئے اسلام

لئے ان تمام ذمہ داریوں کی تفصیل سب کو بتا دی ہے خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد ہوں، چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں، حاکم ہوں یا محکوم ہوں، غریب ہوں یا امیر ہوں۔ وہ الہٰی حدود ہیں جن کی پابندی سے کوئی بھی الگ نہیں ہو سکتا۔

اس پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہر انسان کے لیئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ صرف اپنے حقوق ہی کو اپنے سامنے نہ رکھے بلکہ اس کو بھی پوری طرح یاد رکھے کہ اللہ اور اس کی تمام مخلوق سے متعلق اس کی بھی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں جنہیں پورا کرنا اس کے لیئے ہر حال میں ضروری ہے اور بغیر انھیں انجام دیئے وہ کبھی پورا مسلمان نہیں بن سکتا۔

شہداءِ اُحد

سنہ ۲ ہجری کی مشہور جنگ "بدر" کے زخم خوردہ مشرکوں نے مسلمانوں پر چڑھائی کا پھر ارادہ کیا اور چوتھی شوال سنہ ۳ھ بدھ کے روز ابوسفیان کی کمان میں ایک لشکر مدینہ کے بالکل نزدیک آکر ٹھہر گیا جس کے ساتھ ہر طرح کا جنگی ساز و سامان تھا اور اس میں تین ہزار مسلح سپاہی اور بڑے جنگ آزمودہ لڑنے والے موجود تھے۔ سرورِ کائنات اس زبردست لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ہزار مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے باہر تشریف لائے مگر عبداللہ بن اُبیّ اپنے تین سو ساتھیوں کو یہ کہکر واپس لے گیا کہ ہم مدینہ کے باہر جنگ نہیں کریں گے بلکہ اگر دشمن نے شہر پر حملہ کر دیا تو اس وقت لڑیں گے۔ اس منافقت کی چال کے بعد لشکر اسلام میں صرف سات سو سپاہی رہ گئے تھے۔ "اُحد" ایک مشہور پہاڑ کا نام ہے جو مدینۂ منوّرہ

سے شمال کی طرف تقریباً دو میل پر واقع ہے - اسی پہاڑ کے سامنے یہ خونریز جنگ ہوئی تھی - مسلمانوں نے اپنی پشت کی طرف پہاڑ کو لے کر دشمنوں کا مقابلہ کیا - اسلامی فوج کے پیچھے کی طرف ایک گھاٹی تھی جس سے دشمن کے حملہ کا ہر وقت خطرہ تھا اس لیے آں حضرت نے اس گھاٹی کی حفاظت کی غرض سے پچاس تیر اندازوں کو مقرر فرما دیا تھا تاکہ پشت کی طرف سے کفار حملہ نہ کر سکیں -

لڑائی شروع ہوئی - پہلی مرتبہ مسلمانوں کو زبردست فتح حاصل ہو گئی اور کفار کی فوج نے میدان چھوڑ دیا - اور تمام لوگ کافروں کے چھوڑے ہوئے مالِ غنیمت کو لوٹنے میں مشغول ہو گئے - یہ دیکھ کر تیر انداز دستہ نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور عبداللہ رضؓ بن جبیر اور ان کے چند ساتھیوں کے سوا سب لوٹ میں شریک ہو گئے - کفار کے لشکر نے جب یہ حالت دیکھی تو اس نے پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا - اس اچانک حملہ کا یہ اثر ہوا کہ پورے اسلامی لشکر میں افراتفری پھیل گئی - عبداللہ بن جبیر اور ان کے تیر انداز ساتھی بھی سب شہید ہو گئے - مسلمانوں کے ستر جانباز اس

معرکہ میں کام آگئے مگر غربت و افلاس کا یہ عالم تھا کہ لاشوں کو چھپانے کے لیئے کپڑا بھی موجود نہ تھا۔ حضرت مُصعَبؓ بن عُمیر جو انتہائی حسین و جمیل اور سرورِ کائنات سے شکل و صورت میں کچھ مشابہت رکھتے تھے۔ اُن کی لاش کو جب چادر سے چھپایا جانے لگا تو کبھی سر کھل جاتا اور کبھی پیر پھر آنحضرتؐ کے حکم سے اُن کے سر کو ڈھانک دیا گیا اور پیروں پر گھاس ڈال دی گئی۔

میدانِ اُحد میں جو مہاجرین و انصار شہید ہوئے تھے اُن میں سے کچھ یہ ہیں۔

بنی ہاشم میں: حضرتِ حمزہؓ بن عبدالمطلبؓ جو سرورِ کائنات کے چچا بھی تھے اور دودھ شریک بھائی بھی۔ آپ کی شجاعت عربوں میں مثال کے طور پہ پیش کی جاتی تھی۔ معرکۂ اُحد میں آپ نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ حضرت حمزہؓ کو دھوکے سے جُبَیر بن مُطعِم کے غلام نے شہید کیا جس کا نام "وحشی" تھا۔ اور آپ کی لاش کو ہند اور دوسری کافر مشرک عورتوں اور مردوں نے اس طرح "مثلہ" کیا جس کی مثال

ظلم وجور کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اسی معرکہ میں حضرتِ عبد اللہؓ بن جحشؓ جو رسولؐ اللہ کے برادر نسبتی اور حضرتِ عبد المطّلبؓ کے نواسے تھے شہید ہوئے ۔ بنو عبد الدّار کی عظیم ترین شخصیت حضرت مُصعَبؓ بن عُمیرؓ بھی اسی معرکہ میں کام آ گئے جن کے حُسن وجمال کا قریش میں جواب نہ تھا اور جنہوں نے رسولؐ اللہ کی محبت میں دنیا کا ہر آرام چھوڑ دیا تھا انصار میں سے جو لوگ شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے ان میں حضرت حَنظلہؓ غسیلِ ملائکہ کا نام سب ہی جانتے ہیں ۔ یہ خطاب انہیں خود سرورِ کائنات نے عطا فرمایا تھا کیونکہ فرشتوں نے انھیں غُسل دیا تھا۔

شہدائے احدؐ میں اَنسؓ بن مالک کے چچا اَنس بن نُضرؓ بھی تھے جن کی لاش میں ستر ضربتوں کے نشان پائے گئے تھے ۔ علامہ سُہیلی نے لکھا ہے کہ قبیلہ بنو دِینار کی ایک خاتون کا شوہر، بھائی اور باپ سب معرکہ اُحد میں شہید ہو گئے تھے ۔ اور جب لوگوں نے اس کو اُن کی موت کی خبر سنائی تو بجائے اُن پر غم کرنے کے اُس نے پوچھا کہ خود رسولؐ اللہ کس حال میں ہیں ؟ اور پھر دوڑتی ہوئی

آئی اور جب آنحضرتؐ کو صحیح سالم دیکھا تو خوش ہو کر کہنے لگی: "حضورؐ سلامت رہیں تو پھر ہمیں کسی مصیبت کی بھی کوئی پروا نہیں ہے۔" لوگ چاہتے تھے کہ اپنے اپنے عزیزوں کی میتوں کو مدینہ میں دفن کریں۔ مگر سرورِ کائنات نے حکم دیا کہ سب کو میدانِ اُحد میں دفن کیا جائے۔

عمِ رسولؐ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلبؓ کی قبر مبارک کوہِ اُحد کے بالکل سامنے ہے۔ آپ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ کی نمازِ جنازہ میں سرورِ انبیاءؐ نے ستر تکبیریں کہی تھیں۔

بیت اللہ کیلئے نذر اور ہدیئے

حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے حکم الٰہی کی تعمیل میں بیت اللہ کی بنیادوں کو بلند کیا تھا جس کی طرف قرآن پاک میں سورۃ بقرہ کی (آیہ/۱۲۷) میں اشارہ فرمایا گیا ہے جو "وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاہِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ" کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے یعنی وہ بھی ایک یادگار وقت تھا جب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کعبہ کا وجود اس تعمیر سے قبل نہ تھا بلکہ وہ تو حضرت آدم علیہ السلام ہی کے زمانہ سے تھا جس کی عمارت گر چکی تھی اور صرف بنیادیں رہ گئی تھیں۔ اللہ کے اِن دو برگزیدہ پیغمبروں نے اُس کی دیواریں اٹھائیں۔ جب دیواریں بلند ہوگئیں تو دو دروازے قائم کیے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی زوجہ نے اُن دروازوں کے پردے بنائے تھے اُن ہی نے

سب سے پہلے پوری عمارتِ کعبہ کا غلاف تیار کیا تھا۔

پھر جب حج کا زمانہ آیا اور لوگ اطراف وجوانب سے آکر جمع ہوئے تو انھوں نے اس عمارت اور غلاف وغیرہ کو دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا اور یہ طے کیا کہ ہم بیت اللہ کیلئے ہدیئے اور نذریں لایا کریں گے تاکہ ان کی وجہ سے کعبہ کی خدمت کرنے والوں کو سہولت ہو۔ اس وقت تک کعبہ کی چھت نہ تھی پھر حضرت اسمٰعیلؑ نے لکڑیوں اور درخت کی سوکھی ہوئی شاخوں سے چھت بنائی اور اس پر گیلی مٹی پھیلا دی۔ دوسرے سال جب زمانۂ حج میں لوگ جمع ہوئے تو یہ دیکھ کر اور زیادہ خوش ہوئے اور ہدیئے بھی زیادہ آنے لگے۔ غرض نذروں اور ہدیوں کا سلسلہ بڑھتا رہا۔ یہ ہدیئے مختلف قسم کے ہوا کرتے تھے مگر زیادہ تر جانوروں کی صورت میں ہوتے تھے جنکو اللہ کے حکم سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ذبح کرتے تھے۔
یہی وہ رسم تھی جو بعد میں نسلِ اسمٰعیلؑ میں قُصَیّ بن کلاب کے عہد سے " رِفادَہ " کے لفظ کے ساتھ مشہور ہوئی جس کا مطلب یہ تھا کہ جس شخص کے پاس کعبہ کی تولیت کا منصب ہو وہ ایسے حاجیوں کو جن کے پاس زادِ راہ اور کھانے کا سامان

ختم ہو گیا ہو انھیں کھانا دینے کی خدمت انجام دے۔

پھر اس رسم نے بقول ابن ہشام ایک قسم کے خراج کی حیثیت اختیار کرلی تھی جو موسم حج میں قریش، قصیّ بن کلاب کے حوالہ کیا کرتے تھے۔ جب قصیّ نے اسے خراج کی طرح لازمی شکل دی تو اپنی تقریر میں کہا تھا۔ اے گروہ قریش! تم اللہ کے پڑوسی ہو اور حجاج اللہ کے مہمان ہیں اور اس کے گھر کی زیارت کے لیئے آتے ہیں اور ہر قسم کے مہمانوں میں سب سے زیادہ عزت واحترام کے مستحق ہیں اس لیئے حج کے زمانہ میں ان کے لیئے کھانا پانی تیار رکھو جب تک کہ وہ تمہارے پاس سے واپس نہ چلے جائیں۔ قریش نے یہ بات مان لی اور وہ ہر سال حاجیوں کی میزبانی کے فرائض ادا کرنے کے لیئے قصیّ بن کلاب اور ان کے بعد ان کے جانشینوں کو یہ خراج ادا کرتے تھے۔

غرض یہ تو قریش کی بات تھی مگر عام طور پر حج کے ارادہ سے آنے والے بھی بیت اللہ کے لیئے ہدیئے لایا کرتے تھے اور نذریں پیش کیا کرتے تھے۔ اور متولی کعبہ انھیں خود حاجیوں ہی پر صرف کیا کرتے تھے۔ اور ایسے تمام

حاجی جو کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں اور ان کا سامانِ سفر اور غذا وغیرہ ختم ہو جائے، ان ہدیوں اور نذروں سے ان کی خدمت کی جاتی تھی۔ یہ ہدیئے زیادہ تر اونٹ، گائے اور بھیڑ بکریوں کی شکل میں ہوا کرتے تھے اور کبھی نقد اور زیورات کی صورت میں بھی ہوتے تھے۔ یہ ہدیئے متولّیِ کعبہ یا کسی دوسرے کی مِلک نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ اللہ کی مِلک تھے اور اُس کے گھر کی زیارت کرنے والے مستحق لوگوں کی خدمت میں صرف ہوا کرتے تھے۔ آج بھی اس قسم کے ہدیوں اور نذروں کا یہی شرعی حکم ہے۔ بنیادی بات یہ تھی کہ وہ نذر اور ہدیہ جائز و صحیح اور حلال و مباح ہو اور پھر یہ کہ اُسے اہلِ حاجت اور مستحق حاجیوں کے لیئے صرف کیا جائے۔ مناسکِ حج میں قربانی کے لیئے جو جانور ذبح کیئے جاتے ہیں انھیں بھی ہَدْیَہ یا ہَدِیَّہ کہتے ہیں جبکہ ہَدْیٌ کا لفظ جمع کے معنی میں آتا ہے۔ ؎

؎ ان کا یہ نام اسی وجہ سے ہے کہ یہ بیت اللہ کے لیئے بطور ہدیہ کے پیش کیئے جاتے ہیں۔

بیت اللہ کو خصوصی طور پر زیورات بھی مختلف زمانوں میں ہدیہ کئے گئے تھے جو عہد سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں بھی اور آپ کے بعد بھی محفوظ رکھے گئے ہیں، اِن تمام ہدیوں اور نذروں کا اصلی مقصد صرف یہی ہوتا تھا کہ اللہ کے حکم کی تعمیل کی جائے، اُس کی بارگاہ میں تقرب حاصل ہو اور اُس کی مخلوق کی خدمت انجام دی جائے۔

تلبیہ کی روح (اظہار بندگی)

"تلبیہ" یعنی حاجیوں کا احرام کے وقت سے "لَبَّیک" کہنا۔ اُس آوازِ "لَبَّیک" کی یادگار ہے جو اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ حج پر کائنات کے چپّہ چپّہ سے بلند ہوئی تھی۔ "لبّیک" کہنے سے مقصود بارگاہ الٰہی میں یہ عرض کرنا ہوتا ہے کہ اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم تیری اطاعت اور عبادت پر قائم ہیں اور تیرے بلانے پر حاضر ہیں اور پورے خلوصِ دل کے ساتھ تیری ذات کی طرف متوجہ ہیں۔

خود حضرت ابراہیمؑ نے بھی بار بار "لَبَّیک" کی آواز بلند کی تھی۔ اور اُس وقت بھی "لَبَّیک" کہی تھی جب اللہ نے اُن کو اُن کے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا تھا۔ اس طرح صدائے "لبّیک" خود اُس پُر خلوص آواز کی بھی یادگار ہے جو اللہ کے خلیل کی زبان

مبارک سے بلند ہوئی تھی۔ وہ یادگار وقت جب اللہ کے گھر کی تعمیر کا کام پورا ہو چکا تھا اور حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیل علیہما السلام کعبہ کی عمارت کو تیار کر چکے تھے تو اللہ نے اپنے خلیلؑ کو حکم دیا کہ اب تم لوگوں کو میرے گھر کی طرف حج کے لیئے بلاؤ۔ سورۂ حج آیہ/۲۷ کی یہ آیت اسی فرمان خداوندی کی طرف اشارہ کر رہی ہے: وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾ اور (اے ابراہیم) اب تم تمام لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستوں سے پہنچینگی گی۔ یہ فرمانِ خداوندی سن کر خلیل اللہ نے عرض کی:۔ میرے مالک! یہ میری کمزور آواز دنیا کے تمام انسانوں تک کیسے پہنچ سکے گی! اللہ نے فرمایا اے ابراہیمؑ! تم پکار کے تو دیکھو میں اپنی قدرت سے تمہاری آواز روئے زمین کے گوشہ گوشہ تک پہنچا دوں گا۔ یہ حکم پا کر حضرت ابراہیمؑ کوہ ثبیر کی چوٹی پر چڑھ گئے اور آواز بلند کی۔ اے اللہ کے بندو تمہارے پروردگار نے ایک

گھر معین فرمایا ہے تو تم اس کا حج کرنے کیلئے آؤ۔ اور اللہ کی طرف بلانے والے ابراہیمؑ کی آواز پر "لبیک" کہو۔ ملت مسلمہ کے باپ ابراہیمؑ کی یہ آواز آسمان میں پھیل گئی، فضا کی وسعتوں میں سما گئی، زمین کے ذرہ ذرہ میں اور سمندروں کے قطرہ قطرہ میں اترتی چلی گئی اور اولاد آدمؑ میں سے کوئی مرد اور کوئی عورت نہ رہی جس کے شکم اور نسل میں قیامت تک آنے والی کوئی انسانی روح باقی رہ گئی ہو جس نے خلیلؑ خدا کی یہ صدائے حق نہ سنی ہو اور اس نے "لبیک" "اللھم لبیک" کی آواز نہ بلند کی ہو۔

غرض ہمارے "تلبیہ" کا اصلی مقصد یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے اللہ کے فرمان پر "لبیک" کی آواز بلند کی تھی اور اس کے حکم کے سامنے سر اطاعت جھکایا تھا اور اب سے تین ہزار سال پہلے تسلیم و رضا اور بندگی و عبودیت کا اظہار کیا تھا ہم بھی اُن کی پیروی میں اُسی جذبۂ فرمانبرداری اور جوش عمل کے ساتھ "تلبیہ" کی آواز بلند کرتے رہیں اور مناسکِ حج میں

جہاں جہاں ان برگزیدہ انسانوں نے اللہ کو پکارا تھا ہم بھی اسی لب و لہجہ میں اس نعرۂ حق اور ترانۂ توحید کو دُھراتے رہیں۔ اور جس طرح فخر موجودات اور حاصل کائنات سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قدم قدم پر اس روحِ بندگی کو زندگیِ دوام عطا کی تھی، ان کی پیروی کرنے کی سعادت حاصل کریں۔ اُس وقت بھی جب ہم احرام باندھیں اور اُس وقت بھی جب ہم سواری پر سوار ہوں، سواری سے کہیں اتریں۔ سواری کو کسی طرف موڑیں، بلندی پر چڑھیں، نشیب میں اتریں، جب سحر طالع ہو جب ہماری آنکھ کھلے، جب سوئیں، جب جاگیں، جب کسی قافلہ سے ملاقات ہو، فرض و نافلہ نمازوں کے بعد غرض اس طرح ہمارا کوئی لمحہ ایسا نہ رہے جس میں ہمارا تصوّر اور ہماری زبان اس ترانۂ عبدیت و اطاعت و بندگی سے خالی ہو۔ اور صرف ہماری زبان ہی نہیں بلکہ ہمارا رُواں رُواں اس ترانہ کو دہرانے لگے۔ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ

لَکَ لبّیکَ اِنّ الحمدَ وَ النِّعمۃَ لَکَ وَ المُلکَ
لَا شَرِیکَ لَکَ ۔

فرض شناسی

فرض شناسی ہی درحقیقت انسانی زندگی کا وہ اعلیٰ امتیاز ہے جس کی بنیاد پر انسان کو کائنات کے معاشرہ میں افضلیت کا حق حاصل ہو سکتا ہے اور یہ فرض شناسی ہی ہے جس کے اصول اور ضابطوں کے مجموعہ کا نام "دین" ہے۔

دین کا کام ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کے ہر قسم کے" فرض بتائے۔ وہ بھی جو اس کے خالق کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں اور وہ فرض بھی جن کا تعلق خدا کے بندوں اور اس کی تمام مخلوق سے ہے۔ اس طرح انسان کے لیئے اس کی فرض شناسی کے دو رخ ہیں ایک کا تعلق اللہ سے ہے اور دوسرے کا تعلق اس کے بندوں اور اس کی عام مخلوق سے ہے۔ دین ان تمام فرائض کی تشریح اور تعیین کرتا ہے اور ان کی ادائیگی یا ان سے غفلت برتنے پر جزا اور سزا کا نظام مقرر کرتا ہے اس بنا پر انسان کی فرض شناسی ہی اس کی انسانیت کا معیار ہے اور جس حد تک بھی وہ اپنے

فرائض کو پورا کرنے میں کامیاب ہوگا، اسی حد تک اسے کائنات میں برتری حاصل ہوگی۔

قرآن حکیم نے جہاں انسان کی برتری کا ان لفظوں میں اعلان کیا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل آیہ/۷۰) یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے"

وہاں اس کے ساتھ ہی (سورۂ اعراف/۱۷۹) میں بھی کہدیا ہے: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

یعنی جہنم اُن ہی لوگوں کے لیئے ہے جن کے پاس دل تو موجود ہیں مگر وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ اُن آنکھوں سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان بھی ہیں مگر وہ اُن سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہی لوگ غفلت میں ہیں"

اس طرح قرآن حکیم نے ہمیں انسانی زندگی کے دو رُخ بتائے ہیں۔ ایک انتہائی بلند اور قابل تعریف اور دوسرا بے حد پست اور لائق مذمت اور یہ دونوں رُخ اس کی فرض شناسی

یا فرض ناشناسی ہی کا نتیجہ ہیں۔

جب وہ اپنے فرض کو پوری طرح ادا کرتا ہے تو صرف فرشتے ہی نہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تعظیم کے لیئے جھک جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنے فرض کی طرف سے منہ موڑتا ہے، اپنی ذمہ داریوں کو ٹھکرانے لگتا ہے اور اپنے مقام کو نہیں سمجھتا تو پھر وہ اپنی سطح سے گر کر جانوروں سے بھی نیچے آجاتا ہے۔ وہ بلند ہو کر مسجودِ ملک بنتا ہے اور پست ہو کر پتھروں اور کیڑوں کے آگے خود سجدہ کرنے لگتا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان کی دو ذمہ داریاں ہیں ایک وہ جو خدا کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہے اور دوسری وہ جو خلقِ خدا کی طرف سے ہے۔ جہاں تک انسان کی ان ذمہ داریوں کا تعلق ہے جو اللہ کی طرف سے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ اُن حقوق کو ادا کرے جو بحیثیت پیدا کرنے والے اور زندگی کی صلاحیتیں اور نعمتیں بخشنے والے کے اس کی ذات کی طرف سے انسان پر عائد ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی پر سب سے بڑا حق ہمارے خالق ہی کا ہے اس لیئے بحیثیت ایک مخلوق کے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی معرفت حاصل کریں، اس کی بزرگی اور بڑائی کا دل سے اقرار کریں اور اُس کی

اطاعت وعبادت کریں۔ لیکن اس اطاعت وعبادت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نقط نمازیں پڑھ لیا کریں، روزے رکھ لیں اور حج کے فرض کو ادا کر دیں یا اسی طرح کی کچھ اور خاص قسم کی عبادتیں کر کے یہ سمجھ لیں کہ ہم نے اللہ کی اطاعت اور عبادت کا پورا حق ادا کر دیا اور اب سچے مسلمان بن گئے اور پھر آزادی کے ساتھ جس قدر بھی جرائم اور گناہ ممکن ہوں وہ کرتے رہیں بلکہ اس اطاعت اور عبادت کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو خدا کی مشیت کا تابع بنا دیں اور ہمارا کوئی قول وفعل، کوئی مقصد، خواہش اور ارادہ ایسا نہ ہو جو اس کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف ہو چاہے اس بات کا تعلق ہماری اپنی ذات سے ہو اور ہمارے گھر سے ہو یا قوم، ملک اور پورے انسانی معاشرہ سے یا کائنات کی کسی چیز سے بھی کیوں نہ ہو۔ غرض بحیثیت ایک مخلوق ہونے کے ہماری فرض شناسی کا پہلا فطری اور عقلی تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے پیدا کرنے والے اور اپنے پروردگار کو پہچانیں، اس کے حکم کو سمجھیں اور تابعداری کے کامل جذبہ کے ساتھ اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں اس طرح ایک سچے مسلمان اور پکے مؤمن کی پوری زندگی اطاعت و عبادت الٰہی کا نمونہ ہوتی ہے۔ اس کا ہر قدم سلسلۂ عبادت کی

ایک کڑی ہوا کرتا ہے۔ اور اُس کا ہر تصور اور ہر عمل اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت کے ولولہ سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کے ضمیر کا نعرہ اور دل کی پکار اسی صدائے حق کی گونج ہوا کرتی ہے جس کے بلند کرنے کا بارگاہ خداوندی سے حضرت نبی امیؐ کو حکم ملا تھا:۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْکَ لَہٗ (الانعام آیہ/۱۶۲)

اے نبیؐ کہدو کہ میری نماز، میری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا صرف اللہ کے لیئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے بعد فرض شناسی کا دوسرا مطالبہ ہم سے یہ ہے کہ ہم اپنی اُن ذمہ داریوں کو بھی پورا کریں جن کا تعلق خدا کی مخلوق اور اس کے بندوں سے ہے۔ اُن میں سے کچھ تو وہ ہیں جو کائنات کی عام چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو انسانی معاشرہ سے متعلق ہیں۔ پہلی قسم کی ذمہ داریوں میں سے ہماری ایک بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم کائنات سے آگاہی حاصل کریں، اس کے راز سمجھنے میں تفکر سے کام لیں اور جس قدر ممکن ہو سکے اپنی جہالت کو دور کریں اور

زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی سعی کریں۔ اسکے ساتھ ہی چونکہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی بغیر مل جل کے رہنے کے نہ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے۔ اس لیئے وہ باہمی تعاون کا محتاج ہے اور اسی وجہ سے یقینی طور پر ہر انسان پر دوسرے کی طرف سے کچھ ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہو جاتے ہیں جن کا پورا کرنا اجتماعی زندگی کے تحفظ و بقا کے لیئے بے حد ضروری ہے۔ تعلیم و تربیت، رہائش، غذا، لباس، تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، بیماری، موت، ازدواجی مسائل انسانی اور شہری حقوق اور اسی طرح کی سیکڑوں باتیں ہیں جن میں بغیر باہمی تعاون کے زندگی نہیں گزاری جاسکتی اور معاشرہ کا ہر فرد قدم قدم پر دوسروں کا محتاج ہوا کرتا ہے۔ یہ میل جول کی زندگی لازمی طور پر اس کا مطالبہ کرتی ہے کہ ہر انسان دوسروں کے متعلق اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کرے اور اس طرح سب کے سب آپس میں پورے عدل و انصاف، محبت و الفت، خلوص و اخوت اور رحم و ہمدردی کے ساتھ آپس میں تعاون کریں۔ اس میں وہ ذمہ داریاں بھی شامل ہیں جو گھر والوں سے متعلق ہیں وہ بھی جو محلہ، شہر، قوم یا ملک سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ ذمہ داریاں بھی جن کا تعلق سارے انسانی معاشرہ

سے ہے ۔ اس سلسلہ میں ہماری تمام ذمہ داریوں کے متعلق اسلامی تعلیم پوری وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے ۔ ہمیں جس طرح گھر والوں اور رشتہ داروں کے حقوق سے آگاہ کیا گیا ہے اسی طرح ہمسایہ کے ، محلّہ والوں کے اور معاشرہ کے عام افراد کے حق بھی بتا دیئے گئے ہیں جن کا پورا کرنا ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی زندگی کے لئے ضروری ہے ۔

اسلام نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم سب ایک جسم اور ایک بدن کی طرح ہیں اور جس طرح بدن کے کسی ایک حصّہ کی تکلیف سے سارا بدن تڑپنے لگتا ہے اسی طرح ہم میں سے ہر شخص کے دل میں دوسرے کی تکلیف کا احساس ہونا چاہیئے اور اس تکلیف کو اپنی ذاتی تکلیف کی طرح دور کرنے کا بھرپور ولولہ اور جذبہ بھی ۔ اور یہ بات صرف اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جبکہ معاشرہ کے ہر فرد کا ضمیر فرض شناسی کے جذبہ سے سرشار ہو ۔

غیر مسلموں کے ساتھ کس طرح سلوک کیا جائے

قرآن حکیم کے سورۂ مائدہ آیہ ۸ میں اللہ نے فرمایا ہے
وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی "یعنی کسی گروہ کی دشمنی تم کو ہرگز اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف کو چھوڑ دو (بلکہ) تم ہمیشہ انصاف سے کام لو کہ یہ تقویٰ سے بہت قریب ہے"۔ اس ارشاد خداوندی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ہر حال میں وہ انصاف کے ساتھ کام کریں اور چاہے ان کی اپنی ذات کے مسائل ہوں، گھر والوں کے معاملات ہوں، خاندان والوں کے ہوں، مسلمانوں سے متعلق ہوں یا غیر مسلم قوموں سے تعلق رکھتے ہوں غرض ہر موقع اور ہر محل پر وہ ان حدوں سے تجاوز نہ کریں جو اللہ نے ان کے لیئے مقرر کر دی ہیں کہ یہی سچے مومن اور اصلی مسلمان کی شان ہے۔

ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے: "من لایرحم لایرحم" "جو شخص دوسرے پر رحم نہیں کرتا خود اس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔" اس کا مطلب یہی ہے کہ جو آدمی دوسرے آدمی پر رحم نہیں کرے گا تو وہ اس کا مستحق نہ رہے گا کہ اللہ خود اس پر رحم فرمائے۔

یہ حکم اس قدر عام ہے کہ اس میں اس کی بھی قید نہیں ہے کہ جس پر رحم کھایا جائے وہ مسلمان ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی قابل رحم ہو خواہ کسی مذہب کا پابند ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم، ملکی ہو یا غیر ملکی اس پر رحم کرنا اسلام کی تعلیم ہے۔ خود حضور انورؐ نے، آپ کے اہلبیتؑ اطہار نے، آپ کے صحابۂ کرام نے ہمیشہ کفّار و مشرکین کے ساتھ حسنِ اخلاق کا برتاؤ کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے بدترین دشمن بغیر کسی خوف اور لالچ کے جوق در جوق مسلمان ہوتے رہے اور چند ہی روز میں اسلام مکّہ اور مدینہ سے آگے بڑھ کر دور دور تک پہنچ گیا۔

اسلامی تاریخ کا پڑھنے والا واقف ہے کہ جب ۸ھ میں مکّہ فتح ہوا تھا اور حضورؐ فاتحانہ طریقہ پر وہاں تشریف

لے گئے تھے تو آپ نے مکہ کے مشرکوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے آنحضرتؐ کو بردست تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ (معاذاللہ) یہ آپ کو مجنون کہتے تھے۔ آپ پر پتھر پھینکتے تھے، کوڑا ڈالتے تھے بدترین اور انتہائی غیر اخلاقی لفظ استعمال کرتے تھے۔ شعب ابوطالبؑ میں تین برس تک انھوں نے حضورؐ کو اس پر مجبور کیا کہ آپ اپنے رشتہ داروں میں محصور رہیں اور اس محصوری کے طویل زمانہ میں ان لوگوں نے یہ بھرپور کوشش جاری رکھی کہ حضورؐ کو اور حضورؐ کے ساتھیوں کو آب و غذا سے بھی محروم کردیں۔ اللہ! حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں نے اس پورے تین سال کے زمانہ میں کتنی اذیت اٹھائی ہوگی۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود جب حضورؐ پورے فاتحانہ جاہ و جلال کے ساتھ مکہ میں تشریف لائے اور مسلمانوں کا مکہ پہ پوری طرح قبضہ ہوگیا تو جو کفار و مشرکین آپ کی شانِ کرم سے بے خبر تھے اور سمجھتے تھے کہ آپ صرف ایک دنیوی بادشاہ ہیں انھیں یقین ہوگا کہ آپ اس فتح مبین کے بعد آپ یقیناً مکہ میں قتل عام کا حکم دیدیں گے اور کفار کے ایک ایک مرد

تا ایک ایک عورت اور ایک ایک بچہ کو تہہ تیغ کردیں گے۔
مگر نہیں ایسا نہیں ہوا۔ جب حضورؐ نے ان لوگوں سے فرمایا
کہ اب تم نے دیکھ لیا کہ میں فاتح ہوں اور تم مفتوح ہو اور
تمہاری جانیں میرے قبضہ میں ہیں۔ اب تم خود مجھے بتاؤ
کہ تم کو مجھ سے اس وقت کس قسم کی توقع ہے کہ ان زبردست
تکلیفوں کے بعد جو تم نے مجھے دی تھیں میں تمہارے ساتھ
اب اس وقت کیا عمل کروں گا۔ تو اُس وقت اُن لوگوں
نے عرض کی کہ ہمیں آپ سے اس وقت اُسی سلوک کی توقع
ہے جو ایک بھائی اپنے بھائی سے کر سکتا ہے۔ اس جواب
کو سن کر حضورؐ نے اُن کافروں سے انتقام نہیں لیا، اُن کی
گردنیں نہیں کاٹیں۔ اُن کے گھر لوٹنے کا حکم نہیں دیا بلکہ فرمایا
لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ تم پر آج
کوئی ملامت نہیں ہے اب تم چلے جاؤ تم سب کے سب آزاد
ہو گئے میں نے تمہیں آزاد کر دیا میں ہرگز تم سے انتقام
نہیں لوں گا۔

سچ ہے انتقام کی آگ انسان کی عقل کو جلا دیتی
ہے، آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں نفس پر

قابو رکھنا ایک سچے مسلمان ہی کا شیوہ ہے جس کے سامنے سرورِ کائنات کی روشن سیرت کا نمونہ موجود ہے۔ حضورؐ نے مکہ کے کافروں پر تلوار نہیں اٹھائی، ان سے انتقام نہیں لیا بلکہ اُن پر رحم کیا، اُن کے دل دھڑک رہے تھے کہ مسلمانوں کی تلواریں اب آئیں ہماری گردنوں پر، اور اب رسول اللہ نے ہمارے قتل کا حکم دیا بلکہ حضورؐ نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور کسی سے بھی انتقام نہ لیا۔ یہ دیکھ کر مشرکوں اور غیر مسلموں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ سب کے سب لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا نعرہ لگاتے ہوئے حضورؐ انور کے قدموں پر جھک گئے۔

سرورِ دوعالم کی سیرت ہر مسلمان کے لیے سرچشمہ ہدایت اور ذریعۂ نجات ہے۔

امن وسلامتی

یہ بات کسی گہرے غور وفکر کی محتاج نہیں ہے بلکہ ہر عام آدمی تک اسے پوری طرح سمجھتا ہے کہ بغیر امن و امان اور اطمینان وسلامتی کے کوئی گھر، کوئی خاندان، کوئی قوم اور کوئی ملک باقی نہیں رہ سکتا۔ انسان چونکہ تمدنی ماحول کا محتاج ہے اس لیے اس کی انفرادی اور اجتماعی تمام ترقیاں خواہ وہ زندگی کے کسی میدان سے متعلق ہوں امن وسلامتی کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتیں۔ تیز ہوا کے جھکڑوں اور طوفان کے زبردست تھپیڑوں سے لرزتی ہوئی اور تھرتھراتی ہوئی شاخ پر تو پرندے بھی اپنا آشیانہ نہیں بنا سکتے۔

تعلیم، تجارت، صنعت وحرفت، زراعت، مواصلات اسی طرح نجی اور اجتماعی زندگی کے جتنے معاملے بھی ہوں وہ سب ہی بغیر امن وامان کے کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوسکتے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس معاشرے میں جان ومال

کی حفاظت نہ ہو اور عزت و آبرو محفوظ نہ رہے وہ بہت ہی جلد زندگی اور ترقی کی ہر نعمت سے محروم ہو جائے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے تباہی اور بربادی سے نہیں بچا سکتی۔

اسی لیئے اسلام نے بقا اور ترقی کی اس اہم ترین بنیاد پر بڑی شدت سے زور دیا ہے اور چونکہ اس کا حصول چند عوامل کے بغیر ممکن نہ تھا، اُس نے ابتدا میں اُن عوامل کو ابھارنے کی کوشش کی جن میں سب سے زیادہ اہم اللہ کی بڑائی کا سچے دل سے اعتراف۔ اُس کے علیم و خبیر ہونے کا یقین اور اس کے عذاب اور سزا کا خوف ہے۔ اس کے بعد عمومی حیثیت سے ایک انسان اور خصوصی حیثیت سے ایک مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے احترام کی تعلیم اور ساتھ ہی عدل و انصاف کے تقاضوں پر بھرپور عمل کی تلقین ہے۔

یہی وہ بنیادی عوامل ہیں جن سے انفرادی و اجتماعی امن و سلامتی کا تصوّر وجود میں لایا جا سکتا ہے۔

ان عوامل میں جو روح قدر مشترک کی حیثیت سے

موجود تھی وہ انسانی مساوات تھی اور انسان کا طبقاتی، لسانی، نسلی اور خطہ وارانہ اور دوسری عصبیتوں سے پاک صاف ہونا۔ یہی تعلیم ہمیں قرآن پاک اور حدیث رسولؐ سے ملتی رہی جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا ابتدائی معاشرہ امن وسلامتی کا گہوارہ بن گیا تھا۔ اسلام نے ہمیں ہزارہا ظاہری اور باطنی بتوں کی معبودیت کے پنجہ سے چھڑا کر خدائے واحد کی عبادت کا سبق دیا پھر اسی توحید پرستی سے مسلمانوں میں مرکزیت کا رجحان اجاگر ہوا، دلوں میں اخلاص ومحبت کے جذبات پیدا ہوئے دینی اخوت وبرادری کا تصوّر ابھرنے لگا۔ ایک دوسرے کو دشمن کی نگاہ سے نہیں بلکہ اپنے سگے بھائی کی نظر سے دیکھنے کا عادی بن گیا۔

اللہ کا خوف پھر یہ یقین کہ وہ ہمارے ہر قول وفعل سے باخبر ہے، اس کا اعتقاد کامل کہ اس کے عذاب سے کوئی طاقت ہمیں نہیں بچا سکتی پھر باہمی جذبۂ اخوت ویگانگت یہ سب وہ بنیادی باتیں تھیں اور یہ سب وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی،

امن وسلامتی کی لغمت سے سرشار تھی۔

قرآنِ حکیم نے اس کا اعلان کیا ہے کہ ایک انسان کا ناحق قتل پوری انسانیت کو قتل کر دینے کے برابر ہے اور ایک مؤمن کو جان بوجھ کر ناحق قتل کرنے کی سزا جہنم کا دائمی عذاب ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری حج کے موقع پر اعلان فرمایا تھا کہ مسلمانو! تم میں سے ایک شخص کو دوسرے پر جو چیز برتری اور فوقیت دے سکتی ہے وہ صرف اس کا نیک عمل اور ایمان وتقویٰ ہے۔ دوسری کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو تمہیں فوقیت اور بلندی کا امتیاز دے سکے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے فرمایا تھا کہ ایک مسلمان کی جان، عزت وآبرو اور اس کا مال دوسرے مسلمان کے لیئے یوم الحج کی طرح محترم ہے۔

ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ کے بندو! تم ایک دوسرے سے حسد نہ کیا کرو، آپس میں بغض وعناد نہ رکھو۔ ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو۔ اور آپس میں بھائیوں کی

طرح رہو اور تین روز سے زیادہ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر کسی شرعی جواز کے دوسرے مسلمان سے ترک محبت کرے"۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ تمام مخلوقات گویا اللہ کا کنبہ ہے یعنی اس کی اہمیت ویسی ہی ہے جیسی ایک کنبہ اور خاندان کی ہوتی ہے اور جو اللہ کی مخلوق کو زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے وہی اللہ کا زیادہ محبوب بندہ ہے"۔ کہیں اس طرح فرمایا گیا ہے کہ مسلمانو! تم اہل زمین پر رحم کرو تو آسمان کا مالک یعنی اللہ تم پر رحم فرمائے گا" اور یہ کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ کی جانب سے بھی رحم نہیں کیا جاتا"۔ ایک حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ اس شخص کا شکریہ ادا فرماتا ہے اور اس کے گناہ بخشدیتا ہے جو راستہ سے کانٹے اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں کو ہٹادے تاکہ لوگوں کو اُن سے اذیت نہ ہو"۔ اسلام قطعی طور پر ایسے افعال کی اجازت نہیں دیتا جو دوسروں کی بلا جرم اور بلا کسی شرعی جواز کے، تکلیف واذیت کا باعث ہوں خواہ وہ افعال کسی شخص سے بھی سرزد ہوں اور کوئی شخص بھی اُن کا

ارتکاب کرے۔ یہی خدا کا خوف تھا، یہی دوسروں کے دکھ درد اور تکلیف واذیت کا احساس تھا، یہی انسانی ہمدردی کا جذبہ تھا اور یہی عدل وانصاف کی مقررہ الٰہی حدود اور تقاضوں کا احترام تھا جس نے مسلمان معاشرے کو دنیا کے تمام معاشروں سے بلند تر بنادیا تھا۔ اسلامی معاشرے میں عدل وانصاف کی قدریں پوری طرح محفوظ تھیں، انسانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی ضمانت اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے دی گئی تھی اور مسلم معاشرہ ان الٰہی حدود واحکام پر پوری طرح عمل پیرا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کبھی کسی کی جرأت وہمت نہ تھی کہ وہ کسی کی جان ومال اور عزت وآبرو پر دست درازی کرسکے اور اسے اپنی ہوسناکی کا شکار بنا سکے۔

اسلام نے تعلیم تقویٰ اسی غرض سے دی ہے کہ مسلمان کا خود ضمیر اور اس کا اپنا شعور ہی الٰہی حدود کی اہمیت سے متاثر ہوجائے اور وہ گناہ کا ارتکاب صرف مادّی سزاؤں کے ڈر ہی سے نہیں بلکہ اللہ کے ڈر کی وجہ سے نہ کرے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک مسلمانوں میں اللہ اور

رسولؐ کے احکام کی عظمت کا بھرپور احساس و شعور رہا اُن کا معاشرہ امن و سلامتی کا مجسمہ بنا رہا اور ان کی اجتماعی زندگی دنیا بھر کے لیئے ایک عظیم مثال بنی رہی۔

عدیؓ بن حاتمؓ سے ایک روایت منقول ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضورؐ انور کی خدمتِ اقدس میں حاضر تھا اسی وقت ایک اور شخص بھی حاضر ہوا۔ بھوک سے نڈھال اور بڑی پریشان حالت کے ساتھ۔ اس نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی۔ حضورؐ! فاقہ مجھے ہلاک کیئے ڈالتا ہے۔ کوئی چیز کھانے کی میرے پاس موجود نہیں ہے۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک دوسرا آدمی بھی آگیا۔ وہ فریاد کر رہا تھا۔ حضور! میں لوٹ لیا گیا۔ راستہ میں ڈاکوؤں نے میرا تمام مال و اسباب چھین لیا۔ کیا کروں! اب میرا کوئی سہارا نہیں رہا۔ یہ سب کچھ سن کر حضورؐ نے فرمایا۔ عدی! کیا تم کبھی حیرہ کے مقام پر گئے ہو؟ میں نے عرض کی کہ میں وہاں گیا تو نہیں مگر اس شہر کا نام سنا ہے۔ حیرہ ایک مشہور شہر تھا جسے مدینۃ النعمان بھی کہا جاتا ہے اور وہ کوفہ کے قریب واقع تھا۔ غرض حضورؐ نے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی فرمایا

کہ عدی! اگر تم زندہ رہے تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ ایک ناقہ سوار خاتون تنہا مقام حیرہ سے مکہ معظمہ کا سفر کرے گی اور وہاں پہنچ کر کعبہ کا طواف کرے گی اور اس دور دراز راستے میں اسے کسی چور اور ڈاکو وغیرہ کا کوئی بھی خوف نہ ہوگا اور کوئی بھی اسے تکلیف پہنچانے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ عدی کہتے ہیں کہ میں دل میں سوچنے لگا کہ یہ حضورؐ کیا فرما رہے ہیں! یہ کیسے ممکن ہو سکے گا! کیا قبیلۂ طئی کے لٹیرے جو دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں سب کے سب فنا ہو جائیں گے جنہوں نے اپنی لوٹ مار اور فسادات سے پورے عربستان میں آگ کے شعلے بھڑکا رکھے ہیں۔

عدی کہتے ہیں کہ میں اس وقت خاموش رہا مگر میں اس زمانہ تک زندہ رہا جب میں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ شہر حیرہ سے ناقہ سوار عورتیں تنہا بلا خوف و خطر مکہ کا سفر کرتی تھیں اور انھیں سیکڑوں میل کے اس راستہ میں کسی قتل و غارت لوٹ مار کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح اسلام کی تعلیم اور سچے مسلمانوں کے کردار نے پورے مسلم معاشرے کو گہوارۂ امن و سلامتی بنا دیا تھا۔

کیا آج بھی ہم اس پہ غور کرنے کے لیئے تیار ہیں؟ کہ ہم کس حد تک مسلمان ہیں، کس حد تک احکام خدا اور رسولؐ پر عامل ہیں، کس حد تک ہمیں دوسروں کی تکلیف کا احساس ہے اور کس حد تک ہم اسلام کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں۔

آج جبکہ ساری دنیا بدامنی کا شکار ہے ایک ہم مسلمان ہی ہیں جو اسلامی تعلیمات پر بھرپور طریقہ پر عمل کر کے دنیا بھر کو بتا سکتے ہیں کہ ہم سے بہتر طریقہ پر اجتماعی امن و سلامتی کی مثال کوئی دوسری قوم نہیں پیش کر سکتی۔

اللہ نے قرآنِ حکیم میں اس کا اعلان فرما دیا ہے مسلمانو! اگر تم سچے ایماندار بن جاؤ تو بزرگی و برتری تمہارا مقدر ہے۔

وفائے عہد

عہد و پیمان کی پابندی اور اسے پورا کرنا انسان کی بلند ترین صفت ہے جسے اسلام نے بڑی اہمیت دی ہے۔ ایک سچے مسلمان اور حقیقی انسان کی یہی شان ہونا چاہیے کہ وہ جب بھی کوئی وعدہ کرے اور عہد و پیمان یا قول و قرار کر لے تو اس کو پورا کرے اور کبھی اس میں بد عہدی اور بیوفائی کا پہلو نہ آنے دے قرآن حکیم نے جا بجا عہد اور وعدہ کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے سورۂ اسرا۔(آیہ ۳۴) میں ارشادِ خداوندی ہے:

"وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" "یعنی عہد کو پورا کیا کرو۔ قیامت میں عہد کے متعلق پوچھ کچھ ہوگی۔" اسی طرح سورۂ مائدہ آیہ/۱) میں فرمایا گیا ہے: يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ "اے ایمان والو! جو قرار تم آپس میں کر لیتے ہو اس کی پابندی کرو۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یہاں تک فرما دیا ہے: لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَہْدَ لَہٗ " اس شخص کا کوئی دین ہی نہیں ہے جو عہد و قرار کا پابند نہ ہو"

خود حضورؐ اکرم کی ذاتِ اقدس بھی ہمارے لیئے جہاں اور اسلامی تعلیمات میں ایک عظیم مثال اور نمونہ ہے، عہد و قرار کی پابندی میں بھی ہمیں آپ کی سیرتِ پاک سے ایسی مثال ملتی ہے جو انسانی تاریخ میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

آپ کے سخت ترین دشمن بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ سے بڑھ کر کوئی دوسرا شخص ایفائے عہد نہیں کر سکتا اور اسی بنا پر سب لوگ آپ کو " امین " کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ امانتداری کی صفت انسان میں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ وہ عہد کی خلاف ورزی نہ کرے۔

روم کے شہنشاہ ہرقلؔ نے اپنے بھرے ہوئے دربار میں جب ابو سفیان سے پوچھا تھا کہ یہ نو بنائی کبھی محمدؐ نے کسی سے عہد کی خلاف ورزی تو نہیں کی ۔۔؟

ابوسفیان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور سرورِ کائنات کے سخت ترین مخالف تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے قیصر روم سے کہا کہ نہیں اے شہنشاہ! انھوں نے کبھی کسی سے بیوفائی نہیں کی اور وہ عہد و قرار کے بڑے سخت پابند ہیں۔

سرورِ دو عالم کے ایفائے عہد کا یہ واقعہ تاریخ میں ہمیشہ ثبت رہے گا کہ جب ۶ھ میں مکہ کے مشرکوں سے حُدَیبیہ کے مقام پر صلح کا مسودہ لکھا جا رہا تھا جس میں حضورِ انور نے اپنے عظیم تدبّر اور گہری مصلحت کی بنا پر اور مسلمانوں کے بہتر مستقبل کے پیش نظر دشمن کی اس شرط کو منظور کر لیا تھا کہ جو مشرک مدینہ میں جا کر پناہ لے گا اسے مسلمان واپس کر دیں گے اور پناہ نہ دیں گے اور جو کوئی مسلمانوں میں سے مشرکوں کی پناہ میں آئیگا اسے مسلمان واپس نہ لے سکیں گے۔ عین اسی وقت ابوجَندَل جو مسلمان ہو چکے تھے اور مشرکوں کی قید میں تھے۔ مکہ سے بھاگ کر حضورؐ کی خدمت میں آ گئے اور فریاد کرنے لگے کہ مجھے آپ اس ظلم اور قید کی مصیبت سے بچا لیجئے۔ یہ وہ

موقع تھا جب ابو جندل کا باپ سہیل بن عمرو کفارِ مکہ کے قائد کی حیثیت سے صلحنامہ لکھوا رہا تھا اور ابھی صلحنامہ پر کسی فریق کے دستخط نہیں ہوئے تھے بلکہ صرف زبانی منظوری دی گئی تھی اس کے باوجود حضورؐ نے ابو جندل کو حکم دیا کہ تم مکہ فوراً واپس جاؤ۔ ہم مشرکوں سے عہد کر چکے ہیں اس لئے مجبور ہیں۔ تمہیں پناہ نہیں دے سکتے ابو جندل! صبر سے کام لو تم عنقریب اس قید سے آزاد ہو جاؤ گے۔

سرورِ کائنات نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ اسلام کے نزدیک بلند ترین انسان وہی ہو سکتا ہے جو عہد و قرار کی بھرپور پابندی کرے اور کوئی بات نہ کرے جس سے عہد کی خلاف ورزی کی جھلک پیدا ہوتی ہو۔

روزہ اور باہمی ہمدردی

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ ... مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

(البقرہ آیہ/۱۸۳) اے

اہل ایمان پہلی امتوں کی طرح تم پر بھی روزہ واجب کیا گیا ہے تاکہ تم پرہیزگار بنو، اس آیۂ کریمہ میں روزہ کی غرض پرہیزگاری قرار دی گئی ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کا روزہ اس کی پرہیزگاری کا سبب نہ بنے تو حقیقت میں وہ روزہ نہیں بلکہ صرف فاقہ ہے۔ روزہ میں جہاں اور فائدے ہیں اور جسم و روح کو بہت سی برائیوں سے نجات حاصل ہوتی ہے ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہے کہ روزہ آپس کی محبت اور ہمدردی کے جذبہ میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے اور اگر یہ جذبہ موجود نہیں ہے تو اسے پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ جب تک کسی پر کوئی مصیبت نہیں پڑتی اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس وقت تک اسے دوسرے کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اس لیے جب کوئی روزہ رکھتا ہے تو اسے صبح سے

شام تک بھوکا اور پیاسا رہنا پڑتا ہے اور وہ دن بھر کے لیے زندگی کی اکثر و بیشتر لذتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہے کہ اس کے دل میں ان بھوکوں کا بھی خیال آجائے جن کے پاس فاقہ توڑنے یا روزہ کے افطار کا بھی سامان موجود نہیں ہوتا اور روزہ میں بھوک اور پیاس اور کھانے پینے کی لذتوں سے محروم ہو کر وہ لوگ جو کبھی غریبوں کی مصیبت کا پورا تصور نہیں کر سکتے تھے اب تصور کرنے لگیں، ان کا شعور جاگ اٹھے، ان کا احساس بیدار ہو جائے اور وہ اپنے غریب اور لاچار بھائیوں کی بھوک اور مصیبتوں کا خیال کرنے لگیں۔ اس طرح اس روزہ کی وجہ سے ہر شخص کے دل میں دوسرے سے محبت و ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اپنے دوسرے بھائیوں کی تکلیفوں کا اور مصیبتوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک مشہور خطبہ ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ رمضان برکت اور رحمت و مغفرت کا مہینہ ہے اس مہینہ کی دوسری فضیلتوں اور برکتوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا ہے۔

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خصوصیت کے ساتھ اس مہینے میں غریبوں اور ناداروں کا خیال رکھیں، بڑوں کا ادب کریں، چھوٹوں

پر نظرِ عنایت رکھیں، اپنی زبان کو بُری باتوں سے محفوظ رکھیں اسی طرح کانوں اور آنکھوں کو بھی گناہ سے بچائیں، یتیموں پر رحم کریں اور اپنے گناہوں سے توبہ کریں"۔

اس کے بعد سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا: جو شخص تم میں سے کسی دوسرے شخص کا روزہ افطار کراتا ہے تو خدا اسے ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب عطا کرتا ہے - اور اُس کے گناہوں کو بخشتا ہے۔ یہ سُنکر اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم نے خدمت رسولؐ میں عرض کی حضور! ہم میں تو بہت سے لوگ غریب ہیں جو دوسرے کے لیے افطاری کا سامان نہیں کر سکتے تو آپ نے فرمایا: وَلَو بِشِقِّ تَمْرَةٍ وَلَو بِشَرْبَةٍ مِّنْ مَّاءٍ" اگر تم اُس روزہ دار کو کھجور کا صرف آدھا حصہ ہی دیدو یا پانی کا ایک گھونٹ ہی پلا دو - جب بھی تمہیں یہی ثواب ملے گا۔ کیونکہ ثواب دل کی نیت اور خلوص پر ملتا ہے اس لیئے افطاری کے سامان کی کمی یا زیادتی پر ثواب کا ملنا موقوف نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس مہینے میں لوگوں کے ساتھ جو اپنے اخلاق کو درست رکھے گا، اس کے قدم قیامت کے روز پل صراط پر سے گذرتے وقت ڈگمگائیں گے نہیں اور وہ آسانی سے اس پر سے گذر جائیگا حقیقت یہ ہے کہ سال بھر میں یہ ایک مہینہ ایسا ہے جس میں اسلامی

تعلیمات پر عمل کرنے کا موقع ملتا ہے اور مسلمان کو اس کے ذاتی اور اجتماعی، گھریلو اور شہری زندگی کے فرائض کو پورا کرنے اور ان کا احساس کرنے کی بڑی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ روزہ کا اصلی مقصد انسان کی جسمانی اور روحانی اصلاح ہے۔ اس اصلاح کے لئے ہمیں اس مقدس مہینے میں دو بڑے ذریعہ دئے گئے ہیں۔ ایک قرآن کریم اور دوسرے روزہ۔ روزہ ہماری روح میں بیداری اور ہمارے مردہ شعور میں زندگی عطا کرتا ہے اور ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم قرآن کریم کی نعمت ہدایت کو حاصل کر سکیں، اس کے نور سے اپنی روح اور دل ودماغ کی تاریکیوں کو دور کریں اور ہم میں اس اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جائیں جو اسلامی زندگی کا ایک بڑا امتیاز ہے۔ روزہ جس طرح غریبوں پر فرض ہے اسی طرح امیروں پر بھی فرض ہے۔ جس طرح رعیت پر اسی طرح حاکموں پر اس کا رکھنا ضروری ہے سوائے ان لوگوں کے جو از روئے شرع مستثنیٰ کر دیئے گئے ہیں۔ روزہ رکھنے سے انسان میں جو صبر اور برداشت کی قوت پیدا ہوتی ہے وہ زندگی کی ہر راہ میں کام آتی ہے اور اچھی اچھی غذاؤں سے پیٹ بھر کر کھانا جس باہمی ہمدردی کے جذبہ اور دوسروں کی بھوک کے احساس سے محروم

رہتے ہیں خود ہماری بھوک کی شدت اس جذبہ کو اجاگر کر دیتی ہے اور یہ روزہ ایک ماہ تک مسلسل ہمارے اس جذبہ کی تربیت کرتا رہتا ہے ۔ ہم مسجدوں میں جاتے ہیں ۔ جماعت کی نمازوں میں شریک ہوتے ہیں آپس میں مل جل کر اور ساتھ بیٹھ کر روزہ افطار کرتے ہیں ، ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہونے کا موقع حاصل کرتا ہے ، جس کے بعد دل میں فطری طور پر خدمت اور حسنِ سلوک کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے ۔

یہ کیسی عظیم تربیت ہے ! مصیبتوں پر صبر کرنے کی ، بھوک اور پیاس کو برداشت کرنے کی ! اور آپس میں ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس کرنے کی ! امن و آرام سے رہنے والے شہری ہوں یا میدانِ جنگ کے بھوکے سپاہی ہوں ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کی بھوک اور تکلیف کا احساس ہو جاتا ہے اور اس میں قربانی اور ہمدردی کی وہ اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے جو کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں ہو سکتی ۔

عزم و عمل

عزم و عمل ہی وہ اہم ترین بنیادیں ہیں جن کے بغیر انسانی برتری کا کوئی تصور ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ حکیم نے اسی بات کو کھلے ہوئے لفظوں میں اس طرح فرمایا ہے۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (سورۃ آل عمران آیہ/۱۳۹)

یعنی اگر تم میں سچا ایمان ہے تو تم ہی سب سے بلند اور سب پر غالب ہو گے"۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جس بلندی کو اسلام عزت اور برتری سمجھتا ہے اُس کا حصول صرف اس چیز پر منحصر ہے کہ انسان میں سچا ایمان پایا جائے اور وہ محکم یقین، پکے عزم اور کردار و عمل کی بلندی اور پاکیزگی کے اُس معیار پر پورا اترے جسے اللہ نے ایک سچے مؤمن اور کامل انسان کی علامت قرار دیا ہے۔

"اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" ایک ایسا جامع جملہ ہے جس میں ضمیر کی پاکیزگی اور عملِ صالح کی ہر وہ صفت آجاتی ہے جو

سچے ایمان کے لیئے لازم اور ضروری ہے اور پھر اس سے پیشتر "وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا" فرماکر عزم و استقامت کی صفت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ایمان سچّا ہے اور یقین کامل ہے تو کبھی مسلمان مصیبتوں، پریشانیوں، شکستوں اور زمانہ کے سخت اور بڑے سے بڑے حادثوں پر بھی نہیں گھبرائے گا، وہ ہمیشہ اپنے اللہ پر بھروسا رکھے گا۔ آفتوں اور مصائب کے طوفانوں کا بہادری اور شجاعت کے ساتھ مقابلہ کرے گا اور سیلاب غم و مصیبت کیسا ہی اندوہناک اور کتنا ہی سخت اور شدید ہو مگر وہ اس کے قدم استقلال و عزم میں کوئی جنبش نہیں پیدا کر سکتا۔ اللہ نے اپنے اس ارشاد سے ایک سچّے مومن کی اصلی شان کا اظہار کیا ہے کہ وہ کبھی مایوس اور ناامید نہیں ہوتا۔ زمانہ کی گردشیں اسکی قوّتِ عمل کو سست نہیں کر سکتیں، اس کا ذہن اور ضمیر کسی لمحہ پہ بھی اپنی شکست کا اظہار نہیں کرتا، بزدلی اور کم ہمتی اس کی فطرت اور طبیعت کے منافی اور اس کی ضد ہے، وہ ہمیشہ اپنی ہر شکست اور ناکامیابی کو فتح و کامرانی کا دروازہ سمجھتا ہے۔ اور ہر طوفانِ بلا کو اپنا ساحلِ مراد خیال کرتا ہے، وہ کبھی اپنے آپ کو مشکلات اور مصائب کے

حوالہ نہیں کرتا بلکہ پکّے ایمانی عزم اور فولادی صبر و ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دیتا ہے جس کے بعد دنیا اور آخرت کی کامیابیاں اور بلندیاں اس کے قدم چومنے لگتی ہیں۔ اسلام کی پوری تاریخ عزم و عمل کی تعلیم اور روشن مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ حضرت سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپکے اہل بیت اطہار اور صحابہ رضی کرام کی مثالی اور پاک زندگی تمام انسانیت کے لیئے عزم و عمل کی بہترین مثال ہے۔ مکّہ اور مدینہ کی ابتدائی زندگی میں مسلمانوں نے رسولِ مدنی کی عظیم قیادت میں جو عزم و عمل کے نمونے پیش کیئے تھے وہ انسانی تاریخ میں لازوال ہیں اور مُسلم نسل کے لیئے مشعلِ راہ کا کام دیتے رہیں گے وہ تعداد میں بہت کم تھے، ان کے پاس دولت و مالِ دنیا کا کوئی ذخیرہ اور انبار نہ تھا۔ اور نہ اُن کے لیئے اندرونی یا باہر کی کسی امداد کا کوئی سہارا موجود تھا۔ ان کی دولت ان کا ایمان تھا، اُن کی طاقت و قوت ان کا یقینِ محکم تھا، اُن کا اسلحہ اُن کی تنظیم آپس کی محبت و یگانگت، ان کی وحدت اور باہمی اتحاد و اتفاق تھا اور ان کا سب سے بڑا سہارا حضرتِ رسولِ اسلام کی قیادتِ عظمیٰ تھی جس نے اُن غریب فقیر اور مفلس انسانوں کو پہاڑ کی

طرح ثابت قدم بنا دیا اور ان کے ذہن و فکر کو کچھ اس طرح بدل دیا کہ وہ اپنے لیئے ہر مصیبت کو نعمت و راحت اور ہر شکست کو فتح و کامرانی کا عنوان سمجھنے لگے ان کے نزدیک ذلت اور غلامی کی عیش و آرام سے بھری ہوئی زندگی بدترین اور بے حد بھیانک موت سے زیادہ قابل نفرت تھی۔ عزت کی موت اور اللہ کی راہ میں شہادت ان کی ابدی فتح اور لازوال بلندی و کامیابی کا نشان تھی یہ وہ وقت تھا جب ساری دنیا پر ظلم اور لاقانونیت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ساری انسانیت استبداد اور استحصال کے شعلوں میں جل رہی تھی۔ کسی میں دم نہ تھا کہ وہ اس وقت کی مظلوم اور دکھی انسانیت کو سہارا دیتا اور اسے بے رحم انسانی درندوں سے نجات دلانے کیلئے آگے بڑھتا۔ دنیا تھوڑا سا غور و فکر کرلے! اور ایک مرتبہ تاریخ کے اُس بھیانک دور کو اپنی آنکھوں کے سامنے لے آئے! جب یتیم عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنہا اٹھ کر پوری دنیا کے ظالموں اور جباروں کو للکارا تھا، ایک ایسی پرشکوہ اور پروقار آواز کے ساتھ جس نے مشرکین عرب اور دنیا بھر کے سفاک اور بے رحم درندوں کے حوصلے پست کر دیئے اور ایک ایسے پاک ضمیر کے ساتھ جو عزم و عمل کا بے مثل

مشاہکار تھا۔ آپ نے غافل اور جاہل انسانوں کو واحد اللہ سے
روشناس کیا جس کی عظمت و قدرت میں اس کا کوئی شریک
نہیں اور بتایا کہ عزت و بزرگی کے لیئے تمہارے تمام معیار بے
حقیقت اور باطل ہیں درحقیقت عزت والا انسان صرف وہ ہے
جو عزم وعمل کے اعتبار سے اللہ کی بارگاہ میں تقرب رکھتا ہو چاہے
وہ غریب ہو یا امیر ہو، حاکم ہو یا محکوم ہو اور چاہے وہ کسی نسل،
خطہ اور ملک سے تعلق رکھتا ہو، آپ نے بتایا کہ تمام انسان ایک
دوسرے کے بھائی ہیں اور سب ایک باپ یعنی حضرت آدم علیہ
السلام کی اولاد ہیں۔ کسی شخص کو اس کا حق نہیں کہ وہ دوسرے
کو اپنا غلام بنائے ہر ایک کے لیئے عزم وعمل کے دروازے کھلے
ہوئے ہیں اور عزت و بلندی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ آپ نے
اپنے نعرۂ حق سے سسکتی اور تڑپتی ہوئی اور بے جان انسانیت
کی رگوں میں عزم کی ایک نئی روح اور عمل کی ایک بے پناہ طاقت
بھر دی اور مایوسیوں کے گہرے سمندر میں ڈوبی ہوئی دنیا کو امید
اور نجات کا ساحل نظر آنے لگا۔

عزم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اعلیٰ مقاصد کو حاصل
کرنے کے لیئے جرأت سے کام لے اور کمزوری، ناامیدی، مایوسی

اور بزدلی کے قریب نہ جائے اور یہی وہ انسانی کمال ہے جس سے اس کی قدر و قیمت مقرر کی جاسکتی ہے۔ سرورِ دو عالم کا ارشاد ہے اِنَّمَا لِکُلِّ اُمْرِیٍٔ مَّا نَوٰی" ہر آدمی کے لیئے وہی مقصد حاصل ہوتا ہے جس کا وہ عزم محکم کرلے"

امیرالمؤمنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں قَدْرُ الرَّجُلِ عَلٰی قَدْرِ هِمَّتِہٖ " آدمی کی عزت اسکی ہمت اور عزم کے بقدر ہوا کرتی ہے۔

جہاں تک قرآنِ حکیم کا تعلق ہے اُس نے بغیر کسی اجمال کے پوری صفائی کے ساتھ اس کا اعلان کر دیا ہے کہ اللہ نے بنی آدمؑ کو تمام مخلوقات پر فضیلت دی ہے اور اُن کے لیئے آسمان و زمین کی ہر چیز کو مسخر کیا ہے اور انھیں اس کی پوری صلاحیت بخشی ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائیں، اُن کے لیئے سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے راستے کھلے ہوئے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ انسان کو وہی حاصل ہوگا جسکی وہ سعی اور کوشش کریگا یعنی انسانی فطرت کی بلندی اور ہمہ گیری کے باوجود اس کی ساری کامیابیاں صرف اس کے عزم اور اس کے جہد و عمل ہی سے وابستہ ہیں اور اسی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

آج بانیِ پاکستان کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اُن کی

زندگی پاکستانیوں اور دوسرے تمام مسلمانوں کے لیئے عزم و عمل کی ایک تازہ ترین مثال تھی۔ انھوں نے اسلام کے پیغام عزم و عمل کو اس وقت کی امتِ مسلمہ تک پہنچایا اور خود بھی اس پر عمل کیا جس کے نتیجہ میں دنیا کی سب سے زیادہ عظیم اسلامی مملکت وجود میں آگئی یہ صرف مسلمانوں کے عزم و عمل کا کرشمہ تھا اور اب اس عظیم تر مملکت کا باقی رہنا بھی اور اقوام عالم کی صف میں اس کو وہ مقام حاصل ہونا جس کی یہ حقدار ہے اسی بات پر منحصر ہے کہ پوری ملّتِ اسلامیۂ پاکستان عزم و عمل کی شاہراہ پر آگے قدم بڑھاتی رہی رہے اور آپس کی یکجہتی، خلوص، دیانت، باہمی اعتماد، دوستی اور محبت و یگانگت کے ساتھ ایک انتہائی مضبوط چٹان کی طرح پورے تدبّر اور بھرپور اتحاد و اتفاق سے پاکستان کی سالمیت و استحکام اور اسلام کے عظیم تر مفاد کے لیئے کسی جد و جہد اور سعی و کوشش سے غفلت نہ کرے۔

مقامِ بدر

اسلامی تاریخ میں "بدر" کے مقام کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ خاص طور پر یہ شہرت اُس وقت اسے حاصل ہوگئی جب یہاں قریش مکہ اور مدینۂ منوّرہ کے اسلامی لشکر کے درمیان زبردست اور انتہائی فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی۔ عام طور پر یورپ کے غیر مسلم مورخ اسلام کے متعلق یہ انتہائی گمراہ کن پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ اسے تلوار کی مدد سے اور جارحانہ جنگوں کے ذریعہ سے پھیلایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بات حقیقت سے ذرا سا بھی لگاؤ نہیں رکھتی کیونکہ اسلام تلوار کے وسیلے سے نہیں بلکہ اخلاق کی بلندی اور اس کی ہمہ گیر اور آفاقی بہترین روحانی و اصلاحی تعلیم کے واسطے سے پھیلا ہے اگر اسلام تلواروں کے ذریعہ سے پھیلا گیا ہوتا تو ایک معمولی ذہن رکھنے والا بچہ بھی یہ سوال کرنے کا حق رکھتا ہے

کہ ابتدائے اسلام میں جب مسلمانوں کے پاس نہ مال تھا، نہ اقتصادی وسیلے تھے، نہ اسلحہ کے انبار تھے، نہ کوئی فوجی طاقت تھی، نہ کہیں سے امداد ملنے کا سہارا تھا اور نہ کوئی بڑی جماعت اور افرادی طاقت تھی۔ ایسے مایوسی اور نا امیدی کے ماحول میں ان گنتی کے چند لوگوں کے پاس تلواریں کہاں سے آگئیں۔ اس کا صاف جواب اور واحد جواب یہی ہے کہ اسلام تلوار کی طاقت سے نہیں بلکہ روحانیت، دیانت، کردار کی بلندی اور اپنی عظیم اصلاحی طاقت کے ذریعہ سے پھیلا اور اس پر کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی کوئی جنگ بھی جو غیر مسلموں سے لڑی گئی ہو کبھی جارحانہ نہ تھی بلکہ ہمیشہ حضور انور کی ہدایت اور حکم کے مطابق جب کبھی بھی مسلمان جنگ کے لئے میدان میں نکلے، ان کی غرض مدافعت رہی نہ کہ جارحیت۔

جنگ "بدر" اسلام کی مشہور جنگوں میں سب سے پہلی بڑی جنگ تھی جو ۲ھ میں ہوئی تھی اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے "مقام "بدر" کی جغرافیائی حیثیت پر غور کر لیں

تو یہ بات بہت آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کی غرض اس جنگ میں بھی قطعی طور پر مدافعانہ تھی۔ جبکہ اسلام دشمن مورخوں نے اپنا سارا زور اسی بات پر لگا دیا ہے کہ یہ جنگ جارحانہ تھی اور اس کی اصلی غرض ابوسفیان کے اس بڑے تجارتی قافلہ کو لوٹنا تھا جو شام سے مکہ کی طرف واپس جا رہا تھا۔

"بدر" کی جغرافیائی حیثیت یہ ہے کہ یہ "بحر احمر" کے کنارے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ مکہ سے جو تجارتی قافلے شام جایا کرتے تھے وہ زیادہ تر "بدر" ہی کی طرف سے ہو کر گذرتے تھے۔ یہ اُن مشہور مقامات میں سے ایک مقام ہے جہاں ہر سال عرب قوم کے میلے اور بڑے بڑے بازار لگائے جاتے تھے، جانور ذبح کیئے جاتے تھے اور خوب جشن منایا جاتا تھا جس طرح تیرتھ گاہوں پر ہوا کرتا ہے۔ اس جگہ کچھ پہاڑی سلسلہ بھی ہے اور ریت کے ٹیلے بھی ہیں اور ریتیلی زمین بھی ہے۔

"بدر" ایک گاؤں کا نام ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں اسلام کی چھوٹی سی فوج کو اللہ نے اس کے

عزم و استقلال اور ایمان و یقینِ محکم کی بدولت فتحِ مبین کی دولت عطا فرمائی تھی۔

اس کی جائے وقوع کے متعلق مورخوں اور سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اس گاؤں کو ایک شخص نے آباد کیا تھا جس کا نام "بدر بن مخلد" تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ "بدر بن الحارث" نام کے ایک شخص نے یہاں ایک کنواں کھودا تھا اور اسی سے سب لوگ پانی پیتے تھے۔ یہ کنواں اسی شخص کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ مدینہ سے "بدر" کا فاصلہ اٹھانوے میل بتایا گیا ہے اور بعض نے اسّی میل۔ آجکل کی سائنسی سہولتوں کی بنا پر یہ فاصلہ اور بھی کم ہو گیا ہے۔ اس فاصلہ کے مقابلہ میں مدینہ سے مکہ کا فاصلہ کئی گنا زیادہ ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مسلمانوں کو اُس وقت دفاعی حملہ کیلئے روانہ کیا تھا جب انھیں اس کا علم ہو چکا تھا کہ مکہ سے ایک انتہائی طاقتور فوج مدینہ سے بالکل نزدیک "مقامِ بدر" پر آ رہی ہے جس نے اپنے تجارتی قافلہ کے بچاؤ کا صرف بہانہ بنایا ہے اور درحقیقت وہ اس بہانہ

سے مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیئے ختم
کر دینا چاہتی ہے اور اگر یہ صورتِ حال نہ ہوتی تو قافلۂ
ابوسفیان کے مکّہ میں آرام کے ساتھ واپس پہنچ جانے
کے بعد کسی فوج کا مدینہ کی طرف مارچ کرنا کوئی معنی
ہی نہیں رکھتا تھا - اس کے ساتھ ہی خود ابوسفیان
کا تجارتی قافلہ بھی پوری طرح مسلح تھا اور خود اُسی
قافلہ سے بھی اس کا پورا امکان اور پورا خوف تھا کہ
وہ اپنے انتہائی چنے ہوئے مسلح فوجیوں کو مدینہ کی
تباہی کے لیئے اور مسلمانوں کے قتلِ عام کے لیئے
بھیج دیتا جبکہ اسے معلوم تھا کہ مسلمانوں کے پاس
نہ تو کسی قسم کا فوجی بچاؤ ہے اور نہ ان کی اقتصادی
حالت ہی اس قابل ہے کہ وہ اس معمولی سے حملہ
کا دفاع کر سکیں - چنانچہ تاریخ متفقہ طور پر اس
حقیقت پر شاہد ہے کہ قریش کے اُس لشکرِ عظیم
کے مقابلہ میں میدانِ "بدر" میں مسلمانوں کی تعداد
صرف ۳۱۳ تھی جنکے پاس نہ سامان جنگ تھا اور
نہ سواری کے جانور - اسلحہ جنگ میں چھ زرہیں، آٹھ

تلواریں - صرف تین گھوڑے - ستّر خچر اور تقریباً ۸۰ اسّی اونٹ تھے - اور دشمن کی فوج کے پاس ہر قسم کا سامان جنگ بھی تھا اور اس کی تعداد بھی مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی - غرض "بدر" کی آبادی "بحر احمر" کی مشرقی سمت کی طرف واقع ہوئی تھی اور مدینہ کا محل وقوع بحر احمر کے جنوب مغرب میں تھا۔ مکّہ مکرمہ بدر سے تقریباً ۱۳ روز کی راہ پر تھا اور مدینہ صرف تین دن کی راہ پر تھا - ظاہر ہے اس جغرافیائی حیثیت کو دیکھ کر کوئی ہوشمند مورّخ اور انصاف پسند انسان مسلمانوں کو جارحیت پسند کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا -

عزم و ہمت

اسلام کی پوری تاریخ عزم و ہمت کی عملی اور فکری تعلیم سے بھری ہوئی ہے۔ حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت پاک اور آلِ اطہار اور صحابہؓ کرام کی زندگیاں تمام انسانیت کے لئے عزم و ہمت کی بہترین مثال ہیں۔

سرورِ کائنات نے مکہ میں جب اسلام کی آواز بلند فرمائی تو آپ تنہا تھے۔ آپ کے ساتھ نہ لشکر تھا، نہ اسلحہ تھا اور نہ دولت کے انبار تھے۔ حضرت ام المؤمنین خدیجہؓ الکبریٰ کی تجارت کا جو کچھ سرمایہ تھا وہ بھی چند ہی دنوں میں اسلام کی راہ میں ختم ہو گیا۔ اور جن لوگوں سے مقابلہ تھا اُن کے پاس ہر قسم کی مادّی طاقت موجود تھی۔ ان کے پاس لاتعداد فوجیں تھیں بیشمار اسلحہ تھا اور نہ ختم ہونے والی دولت کے خزانے تھے۔ پورے عربستان میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی ہر ایک قبیلہ کا الگ خدا تھا۔ بات بات پر انسانوں کا خون

بہایا جاتا تھا اور پوری عرب قوم آپس کی خانہ جنگی میں گھری ہوئی تھی۔ بنو قیس عَیلان اور قریش میں شدید جنگ چھڑی ہوئی تھی اور سارا جزیرہ نمائے عرب میدانِ کارزار بنا ہوا تھا۔ کسی شخص کی عزت و آبرو اور مال و دولت کی حفاظت نہ تھی، ظلم و جور کا دَور دَورہ تھا ایک قطرۂ خون کے انتقام میں لاکھوں قطرے گرا دئے جاتے تھے مگر اس کے باوجود کینہ، حسد اور انتقام کی آگ دلوں میں بھڑکتی ہی رہتی تھی۔ لوگوں کی زندگی زیادہ تر لوٹ مار میں بسر ہوتی تھی اور اس پر فخر و ناز بھی کیا کرتے تھے۔ سرورؐ انبیاء جب لوگوں سے فرماتے تھے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئیگا جب "یمن" سے ایک محمل نشین عورت سفر کر سکے گی اور خدا کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہوگا" تو یہ سن کر سب کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکے گا۔ ایسے خطرناک حالات میں رسولؐ اکرم نے اسلام کا نعرہ بلند کیا اور مشرکین عرب کو ایک خدا کی تعلیم دی۔ انسان کے خون کی قیمت بتائی اور رحم و کرم کا سبق دیا۔

ابتدائے اسلام میں آپ کے ساتھ جو مخصوص خدا کار تھے وہ بھی آپ کے ساتھ ان سختیوں کا شکار بنے ہوتے تھے۔ انھیں

امن و امان کی تلاش میں صحراؤں اور ریگستانوں میں پھرنا پڑتا تھا اور آخر بہت سے لوگ بحکم آنحضرتؐ مکہ سے ہجرت کر کے حبش کی طرف چلے گئے۔ اور وہاں پہنچ کر بھی اپنے فرض سے غافل نہ رہے اور اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ قرآن حکیم میں ان ہی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ سورۂ انفال (۲۶) تم وہ وقت یاد کرو جب تم ملک میں بہت کم اور بے بس تھے اور ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اُچک لیجائیں گے تو خدا نے تمہیں پناہ دی اور اپنی مدد سے تمہاری تائید کی اور تمہیں پاک و پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا کیا تاکہ تم شکر ادا کرو، غرض ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ تو خود ملکی حالات تھے اس کے علاوہ ملک سے باہر کی حالت بھی کچھ اس سے کم خراب نہ تھی۔ مجموعی طور پر سارے کرۂ زمین پر ظلم وجود اور لاقانونیت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ایک آدمی تو کیا بڑی بڑی طاقتور فوجوں کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ اُس دورِ جہالت اور زمانہ ظلم و استبداد میں اصلاح کا نعرہ بلند کر سکتیں یہ کتنے بڑے عزم و ہمت

کی بات تھی کہ رسولؐ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے تنہا پوری
دنیا کے انسانی درندوں کو للکارا اور کسی طاقت واقتدار سے
آپ خوف زدہ نہ ہوئے اور آپ کے ضمیر کو کوئی مادّی اور دنیوی
خواہش خرید سکی۔ اس ابتدائی مگر بظاہر انتہائی مایوس کن
اور خطرناک ماحول میں آپ کے جن اہل خاندان اور دوسرے مخلص
افراد نے ساتھ دیا ان کے ضمیر اور شعور پر بھی آپ کے پاک نفس اور
عزم محکم کا عکس تھا۔ انھوں نے بھی دنیا کی ہر لالچ کو ٹھکرا دیا تھا
اور اپنی قوم، خاندان، منصب و دولت یہاں تک کہ اپنے ماں باپ
اور اولاد تک کو چھوڑ کر رحمت مجسم کے قدموں سے لگے تھے جبکہ
انھیں اس کا پورا یقین تھا کہ رسولؐ اکرم کا ساتھ دینے میں انھیں
اپنی زندگی سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے جسے ایک معمولی سمجھ رکھنے والا آدمی
بھی بڑی آسانی سے محسوس کر سکتا ہے کہ اُس وقت جب بالکل
ابتداء میں سرورِ کائنات نے اسلام کی آواز بلند کی تھی آپ کے
پاس نہ فوج تھی نہ اسلحہ تھا، نہ ساتھیوں کی کثرت تھی اور نہ دوسرا
سامان جنگ ہی تھا جس کے بھروسے پر یہ کہا جا سکتا کہ آپ ظلم و
جور کی مضبوط چٹانوں کو توڑ دیں گے اور سارے جزیرہ نمائے

عرب اور بیرونی دنیا کو فتح کریں گے اور پھر آپ کے ساتھی بڑے بڑے منصوبوں اور دولت کے خزانوں کے مالک بن جائیں گے۔ اس کا تو اس وقت کوئی تصور بھی نہ تھا اور نہ ہو ہی سکتا تھا۔ حالات کسی سے پوشیدہ نہ تھے۔ افلاس، بھوک، خوف و ہراس، جلاوطنی، عزت و آبرو کی تباہی، توہین، عداوتیں، خونریزی اور دنیوی عیش و آرام کی طرف سے ناامیدی میں سے ہر چیز اپنی پوری بھیانک صورت میں ہر مسلمان کے سامنے تھی مگر ان میں سے کوئی بات بھی ان کے عزم و ہمت کو کم نہ کر سکی اور خوف و طمع سے بے نیاز ہو کر وہ اسی طرح حضرت نبیؐ امیؐ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سمٹ آئے جس طرح شمع پر پروانے ٹوٹ پڑتے ہیں اور ان کے سامنے اسلام کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا۔ حضرت سرورؐ کائنات اور آپ کے مٹھی بھر مخلص اور وفادار ساتھیوں نے کتنے بڑے عزم سے کام لیا اور کس طرح بلاؤں، مصیبتوں اور تباہیوں کے طوفان کا مقابلہ کیا۔ اس حقیقت کو ہر پڑھا لکھا جانتا ہے اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام قطعی طور پر تلوار سے نہیں پھیلا بلکہ رسول اللہؐ اور آپ کے اصحابؓ کرام اور آپ کی آلؑ اطہار کے عزم و ہمت سے پھیلا تھا۔ جنھوں نے اپنی تمام

دولت وعزت اسلام کی راہ میں پیش کر دی اور اپنی اور اپنے بچوں اور عزیزوں کی جانیں اسلام پر قربان کر دیں، قتل وغارت کی سختیاں اٹھائیں قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں مگر ایک لمحہ کے لیئے بھی ان کے عزم وہمت میں کمزوری نہیں پیدا ہو سکی۔ مسلمانوں کی ساری کامیابی اسی عزم کا نتیجہ ہے جو صدائے حق کی گرج نے اُن کے دلوں میں پیدا کیا تھا اور اسی عزم وہمت نے انھیں اس مقام پر پہنچا دیا جہاں اُن کی ٹھوکروں میں دنیا کے بڑے بڑے سرکش اور پُر غرور فرعونوں اور ظالموں کے سر بھی لوٹنے لگے جن کے سامنے یہ بہادر مسلمان اسلام سے پہلے خود اپنے سر جھکایا کرتے تھے، رسولؐ کریم اور آپ کے ان ساتھیوں کے پاس اس وقت مادّی طاقتیں کہاں تھیں! یہی عزم وہمت ہی کی ناقابل تسخیر طاقت تھی جس کی تاب دنیا نہ لا سکی اور آخر عرب کے چپّہ چپّہ اور کرۂ زمین کے گوشہ گوشہ میں فرزند آمنہ اور یتیم عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا نعرۂ حق گونجنے لگا ۲ھ میں پہلی بڑی لڑائی یعنی جنگ بدر کبریٰ میں ننگے اور بھوکے مگر اکثر بہادر دلیر اور صاحبِ عزم ویقین مسلمانوں کی تعداد صرف تین سو تیرہ ۳۱۳ تھی جن میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے اور ان میں سے بہت تھوڑے لوگ تھے جن کے پاس پورا

اسلحہ موجود تھا، جبکہ دشمن پوری طرح مسلّح تھا۔ اور اس کی فوج مسلمانوں سے تعداد میں بھی بہت زیادہ تھی ۔اس صورتِ حال میں کون کہہ سکتا تھا کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگی ۔ اگر یہ لڑائی جو مسلمانوں کے لیئے یقیناً موت اور زندگی کی لڑائی تھی صرف مادّی سامان جنگ سے لڑی گئی ہوتی تو نتیجہ تباہی کے سوا کچھ بھی نہ نکلتا مگر رسُول کریم نے یہ جنگ عزم محکم کے اسلحہ سے لڑی تھی، آپس کے اتحاد اور یکجہتی، تنظیم اور ایمان ویقین کی طاقت کے ساتھ لڑی تھی ۔اس لیئے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور ٹڈی دل دشمن فوج کو شکست ہوئی اور آج اسی عزم وہمت کی وجہ سے مسلمان اس دنیا میں زندہ ہیں بیشک عزم وہمت ہی کی وجہ سے ایک سچّا مسلمان پہچانا جاسکتا ہے۔

تلاشِ حق

"حق" نام ہے اس نقطۂ اعتدال کا جس میں نہ کسی قسم کی کمی اور نقص ہو اور نہ کسی طرح کی زیادتی اور تجاوز۔ یہ نقطۂ اعتدال ہی وہ کیفیت اور وہ حالت ہے جسے کائنات کے خالق نے اپنی ہر مخلوق سے وابستگی عطا کی ہے۔ اسی وابستگی کو عدل اور حق کہتے ہیں اور اسی کا نام حقیقت اور صداقت ہے۔ تعبیریں بدلی ہوئی ہیں، مفہوم اور بات ایک ہی ہے۔

پوری کائنات کی زندگی، وجود اور اس کا کمال، صرف حق یعنی اس کے نقطۂ اعتدال ہی پر منحصر ہے جبتک کوئی مخلوق اِس مرکزِ اعتدال پر باقی رہے گی، کمال سے اس کی وابستگی بھی رہے گی اور وہ فنا ہونے سے بھی محفوظ رہے گی لیکن اگر کبھی اُس کا یہ اعتدال باقی نہیں رہتا تو پھر نہ تو اس کی زندگی اور ہستی ہی باقی رہ سکتی ہے اور نہ اس کا کمال اپنے زوال کو بچا سکتا ہے۔

یہ ایک عقلی مسلمہ ہے کہ حقیقتیں کبھی بدلا نہیں کرتیں، جو چیز

جیسی اصل اور حقیقت میں ہے ویسی ہی رہے گی یعنی کسی وقت
بھی اس کی ماہیت اور اصلیّت میں تبدیلی نہیں آسکتی جیسے حق
ہمیشہ حق ہی رہے گا اور باطل ہمیشہ باطل ہی رہے گا۔ اسی طرح
جس قدر بھی حقیقتیں ہیں انہیں بدلنے پر کائنات کی کوئی قوت،
اقتدار نہیں رکھتی۔ جہانتک تبدیلی کا تعلق ہے وہ صرف اُس
حقیقت کے اظہار اور مظاہرہ ہی میں ہوا کرتی ہے اور وہ بھی صرف
اُس حد تک جس کا تعلق کسی اختیاری عمل رکھنے والی مخلوق سے ہوا
کرتا ہے جیسے انسان۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں
جن پر انسان تصرف کرسکتا ہے اور اپنے عمل سے انہیں کچھ کا کچھ
ظاہر کرسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی اصلیّت کو چھپا کر انہیں
دوسرے روپ میں لاسکتا ہے۔ یہ چیزیں مادّی بھی ہیں اور فکر و نظر
سے متعلق بھی ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل کبھی تو جان بوجھ کر ہوتا ہے اور
کبھی بلا ارادہ اور محض فکر و تحقیق کی کمزوری اور جستجو یا تلاش کے
کمزور اور ناقص ہونے کی وجہ سے۔ لیکن ہر صورت میں، انسانی عمل
حقیقتوں کو خواہ کسی بدلے ہوئے لباس میں بھی پیش کرے اور اُن کا مظاہرہ
کسی دوسرے روپ میں بھی کیوں نہ ہو اور چاہے اِسکے بنیادی اسباب
و وجوہ اختیاری ہوں یا بلا ارادہ اور محض اضطراری، حقیقت اور

اصلیت ہمیشہ ناقابل تبدیلی رہا کرتی ہے خواہ وہ حقیقت مادی ہو یا اس کا فکر، عقل اور اعتقاد سے تعلق ہو ـــــ اس نظریہ کی بنا پر کہ ہر چیز کی صحیح زندگی اور اس کا حقیقی کمال اُس کے نقطۂ اعتدال اور اس کے مرکزِ حق و صداقت سے وابستہ ہے جو خالقِ کائنات نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے اسی لئے فطری اور پیدائشی طور پر ہر چیز میں اپنے نقطۂ اعتدال اور اپنے مرکزِ حق کی تلاش کا جذبہ اور رجحان کار فرما رہتا ہے۔ بیج اسی تلاش میں پھولوں تک اور پھول اسی جستجو میں پھلوں کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی اعتدال کی تلاش ہے جو ذرّوں کو نباتات تک اور پانی کے قطروں کو پرِ پرواز دیکر جانداروں میں شامل کر دیتی ہے۔ غرض کمال نام ہی ہے حق اور اعتدال پر ہونے کا اور زوال کہتے ہی ہیں اس بات کو کہ چیز اپنے مرکزِ عدل سے منحرف ہو جائے۔

اسی بنا پر انسان کی بھی حقیقی زندگی اور حقیقی کمال صرف یہ ہے کہ وہ حق پر ہو اور اُسکی مادی اور فکری و روحانی حیات کا کوئی رُخ بھی جادۂ عدل اور مرکزِ حق سے ذرّہ برابر انحراف نہ رکھتا ہو اور یہ بات اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب وہ حق اور صدق و عدل کی پوری معرفت رکھتا ہو اس لئے اصولی طور پر اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تلاشِ حق

اور جستجوئے کمال میں سرگرداں رہے کیونکہ اُسکے انسانی کمال کا انحصار اس کی اسی تلاش اور اسی جستجو میں ہے۔

قرآن حکیم نے بار بار اُسے اسی جستجو اور اسی تلاشِ حق کی طرف دعوت دی ہے: سورۂ ذاریات ۵۱/۲۰، ۲۱ میں ارشاد ہوتا ہے: "اور یقین رکھنے والوں کے لئے زمین میں اللہ کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی ہیں تو کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا" اسی طرح سورہ بنی اسرائیل (۳۶) میں انسانی وسائلِ فکر و تعقل، کی ذمہ داری اور انسان کے شعوری فرائض کی طرف ان لفظوں میں اشارہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۔ "بیشک کان، آنکھ اور دل کے متعلق ہر شخص سے پوچھ گچھ کی جائے گی"۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ وہ حق اور وہ حقیقت جس کے حاصل کئے بغیر انسان صحیح معنی میں انسان نہیں کہا جا سکتا اور اسے وہ منزلِ کمال نہیں مل سکتی جو کائنات کے معاشرے میں اُس کے لئے مقرر کی گئی ہے جن وسیلوں سے اُس تک رسائی ہو سکتی ہے وہ سب کے سب انسان کے پاس موجود ہیں اور اس کے لئے کسی قسم کی بھی کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے صرف دیر اتنی ہے کہ وہ اُن وسیلوں کو استعمال کرے اور استعمال بھی درست طریقے پر ہو تا کہ وہ گمراہ نہ ہو سکے، اسی بنا پر ان وسائل سے متعلق

انسان کو جواب دہی کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کے موجود ہونے کے بعد پھر کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہ سکتا کہ ہم تلاشِ حق کیونکر کرتے جبکہ ہمارے پاس اس کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ غرض ایک طرف تو فکر و نظر کو پوری طرح ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف ساری کائنات کو ایسی روشن اور کھلی ہوئی نشانیوں سے بھر دیا گیا ہے جو تلاشِ حق اور جستجوئے حق کے مرحلہ کو آسان سے آسان تر بنا دیں تاکہ انسان مسئولیت اور ذمہ داری کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھا جا سکے۔ سورۂ آل عمران (۱۹۰/۱۹۱) میں ارشادِ خداوندی ہے

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ

وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا

بَاطِلًا

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے آنے جانے میں عقل رکھنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں میں برابر یاد کرتے رہتے ہیں (اور کہتے رہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار یہ سب کچھ تو نے بیکار نہیں پیدا کیا ہے۔

اس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ تلاشِ حق کے لئے جس قدر آلات کی ضرورت ہو سکتی تھی وہ سب پہلے ہی عطا کر دیئے گئے تھے اور پھر اُن کی مدد کیلئے ایسی نشانیاں اور علامتیں بھی بتا دی گئیں جن کے سہارے سے حق کی منزل آسانی سے مل سکے، پھر اس کے بعد اسکا بھی اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ذرا سی بھی کوشش کرے گا اس کی قدم قدم پر مدد کی جائے گی۔ شرط صرف یہ ہے کہ سعی و کوشش میں اخلاص ہو اور طریقہ صحیح ہو، سورۂ عنکبوت کے آخر میں یہ اعلان ان لفظوں میں فرمایا گیا ہے: وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا" یعنی جو لوگ ہماری راہ میں سعی و کوشش سے کام لیتے ہیں تو ہم اُنہیں اپنے راستے ضرور دکھا دیں گے۔

انسانیت کی سربلندی اسی تلاشِ حق میں ہے اور حق پر ہونا اور حق مل جانا ہی اس کی زندگی بھی ہے اور زندگی کی معراج بھی ہے، ایسے لوگ دنیا والوں کی نگاہوں میں چاہے مردہ ہوں مگر کتاب اللہ انھیں "اَحْیَاءٌ" یعنی زندہ کہہ کے پکارتی ہے اور زندگی بھی وہ جس میں دوام ہی دوام اور بقا ہی بقا ہے۔ اور جو بدقسمت لوگ اس شعوری فرض کی ادائیگی اور اس معتدل فکر و سعی کی نعمت سے محروم ہیں وہ چاہے ساری دنیا میں زندہ ہوں مگر زندگی و موت اور فنا و بقا کا اصلی معیار

مقرر کرنے والا اللہ اور اس کی کتاب مقدس انہیں مردہ ہی کہتی ہے
اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (انعام آیہ ۱۲۲) حاصل یہ ہے کیا جو شخص مردہ
تھا پھر ہم نے اُسے ایمان کے ذریعہ سے زندگی عطا کر دی وہ اُسکے
برابر ہو سکتا ہے جو کفر کی تاریکی میں پڑا ہے"۔ اس پوری گفتگو کا خلاصہ یہ
ہوا کہ انسان کی پیدائش کا حقیقی مقصد حق کے ساتھ وابستگی ہے۔۔۔
قرآن حکیم کی نظر میں جو حق پر ہے وہ زندہ ہے اور جو حق پر نہیں وہ
مردہ ہے، اس لئے تلاشِ حق انسان کا بنیادی فرض ہے جس کے وسائل
اور نشانیوں سے آفاق و انفس کی پہنائیاں چھلک رہی ہیں۔

اپنے اوپر اعتماد

انسان کی تمام کامیابیاں اور ترقیاں اس بات پر منحصر ہیں کہ وہ اپنی ذات کو اور اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور یہ سمجھے کہ اللہ نے اس کو کس قدر قدرت، صلاحیت، اور قوت بخشی ہے۔ درحقیقت تمام کمزوریوں اور ناکامیوں کی بنیاد یہی ہے کہ آدمی اپنی ذات کو نہیں پہچانتا جبکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ بغیر اپنی صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے ہم نہ تو زندگی کی ان قدروں کو حاصل کر سکتے ہیں جن کے لیئے ہمیں پیدا کیا گیا ہے اور نہ اس اپنے عظیم خالق کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ جس کی طرف حضرت سرورِ کائنات اور حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے: من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اپنے نفس، اپنی ذات اور اپنی عملی اور شعوری صلاحیتوں، وسعتوں اور قابلیتوں سے

واقف ہونا انسان کے واسطے صحیح معنی میں انسان بننے کے لیئے بے حد ضروری ہے۔ یہی وہ دروازہ ہے جس سے اس کو سب کچھ ملتا ہے اور یہی وہ وسیلہ ہے جس سے وہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے اور یہی وہ بنیادی ذریعہ ہے جس سے وہ خدا کی معرفت حاصل کر کے اپنے فرائض زندگی سے آگاہی پیدا کر سکتا ہے اور ایک ایسی صاف اور سیدھی راہ تلاش کر سکتا ہے جس میں اسے تمام ناکامیوں، کمزوریوں اور گمراہیوں سے نجات حاصل ہو۔ تمام نیکیوں کا مرکز انسان کی خود اپنی ہی ذات ہے اور تمام برائیوں کا مرکز بھی یہی ہے اس لیئے جب تک وہ اپنی ذات سے واقفیت حاصل نہ کر لیگا اور اپنی صلاحیتوں کے بُرے اور اچھے پہلوؤں کو نہ سمجھ لے گا اس وقت تک وہ کس طرح برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ خدا کا ارشاد ہے: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران پارہ ۴ رکوع ۵) مسلمانو! تم ہمت نہ ہارو اور غمگین نہ ہو اگر تم سچے مؤمن ہو تو یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔" بلاشبہ ایمان نام ہے خداشناسی کا، اس کی ذات، اس کے صفات اس کی حکومت اور عظمت پر یقین حاصل کرنے کا۔ اور یہ مقام اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک انسان اس حقیقت سے واقف

نہ ہو کہ وہ خود کیا ہے اور اس کا اپنے خالق اور معبود سے کیا تعلق اور کیا رشتہ ہے اور اُن فرائض سے باخبر نہ ہو جو اس کے خالق نے اس کے لیئے معین کردیے ہیں اور وہ انھیں پورا نہ کرے غرض ہر پھر کر بات انسان کی اپنی ہی ذات کی طرف آجاتی ہے۔یہی وہ آئینہ ہے جس میں اُس کو انسانیت کی ساری قدروں کا عکس بھی نظر آئے گا اور اسی میں اسے عرفان خداوندی کے وسیلے اور ذریعہ بھی نظر آجائیں گے اور اگر اس نے اپنی ذات کو بے حقیقت سمجھ کر چھوڑ دیا اور اپنے اوپر اعتماد نہ کیا تو نہ خدا ہی ملیگا اور نہ زندگی کی بلندیاں اور کامیابیاں حاصل ہو سکیں گی۔

ساری فضیلتوں اور کمالات کی اصل یہی ہے کہ آدمی اپنی ذات پر بھروسا کرے۔ ایک استاد کو جب تک اپنی صلاحیت پر اعتماد نہ ہو کہ وہ طلبہ کو پڑھا سکے گا اور ان کی علمی تشفّی کر سکے گا اس وقت تک کبھی وہ تدریس اور پڑھانے کی مہم میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا اسی طرح خود ایک طالب علم بھی اگر اپنی ذات ہی پر اعتماد کرے گا اور اپنی صلاحیتوں پر بھروسا رکھے گا تو علمی باتوں کو سمجھنے میں کامیاب ہو سکے گا اور امتحان میں پاس ہو گا۔ یہ اعتماد جتنا بڑھتا جائے گا اور اس بھروسے میں جسقدر اضافہ ہو گا کامیابی

یقینی بنتی جائیگی۔ ایک علاج کرنے والا اپنی رائے، اپنے ذہن اپنے فہم اور اپنی قابلیت اور مہارت پر پورا اعتماد رکھتا ہے جب ہی وہ اس قابل ہوتا ہے کہ دوسروں کا علاج کر سکے۔ غرض زندگی کے ہر قدم پر خود اعتمادی کے بغیر کسی کامیابی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ ہماری پوری تاریخ خود اعتمادی کی تاریخ ہے اور ہمارے طریقۂ فکر کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی بنیادی بات خود اعتمادی ہے۔

وہ کٹھن وقت جب سرورِ کائنات نے مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ کو آباد کیا تھا ہماری خود اعتمادی کی تاریخ میں بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان افلاس اور تنگدستی میں مبتلا تھے اور اُن کے زندہ رہنے کے لیئے کوئی مادّی سہارا موجود نہ تھا وہ چاروں طرف سے دشمنوں کے سخت اور انتہائی خطرناک حصار میں گھرے ہوئے تھے نہ تو خود ان کے پاس اقتصادی، معاشی اور دفاعی وسائل موجود تھے اور نہ کہیں باہر سے امداد حاصل کرنے کا کوئی امکان تھا۔ ان ہی حالات میں اُن بے سروسامان مجاہدوں نے، اُن عزم و ایمان کے مجسموں نے بدر کی جنگ لڑی جبکہ ان کی کل تعداد ۳۱۳ تھی اور ان کے پاس نہ اسلحہ تھا نہ کوئی دوسرا سامان۔ مقابلہ میں مشرکینِ مکہ کی بھاری فوج تھی جو ہر طرح کے اسلحہ اور جنگی سامان سے لیس تھی۔

مگر جس عظیم ہتھیار سے مسلمانوں کو کامیابی ہوئی اور جس نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا یہی خود اعتمادی تھی جس کی تعلیم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مسلمانوں کو دی تھی - اور آج بھی ہمارے لیئے اس تعلیم کی اہمیت میں کسی قسم کی کمی نہیں پیدا ہوئی ہے۔ ہم نے دنیا کی ایک عظیم اسلامی مملکت، پاکستان کو اپنی اسی اسلامی تعلیم یعنی خود اعتمادی کی طاقت سے حاصل کیا ہے - اگر ہم اپنے اوپر بھروسا نہ کرتے تو آج بھی ہم پہلے کی طرح غلامی کے اندھیرے غار ہی میں پڑے ہوئے سسک رہے ہوتے ہمارا کوئی پرسانِ حال نہ ہوتا اور ہم اپنی زندگی کے ہر ہر قدم پر دوسروں کے رحم وکرم کے محتاج ہوتے - یہ عزت یہ افتخار اور آزادی کی نعمت جو ہمیں حاصل ہوئی ہے محض خود اعتمادی کی وجہ سے ہوئی ہے، اور اس کے بعد ہم نے جو کچھ بھی اب تک کامیابیاں اور ترقیاں حاصل کی ہیں اور ہمارے ملک نے بہت ہی تھوڑی سی مدت میں جو شاندار مقام حاصل کر لیا ہے وہ بھی اسی خود اعتمادی کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ عظیم طاقت ہے جس سے ہم نے ایک بہت بڑے طاقت ور دشمن کو گذشتہ جنگ میں عبرتناک شکست دی تھی اور یہی خود اعتمادی کا ناقابل تسخیر جذبہ ہے جس نے ہماری اس قوم کو جو آزادی ملنے سے پہلے بالکل ہی بے سہارا اور بے بس

بھی آج علمی، صنعتی، اقتصادی، سماجی، سیاسی، دفاعی اور دوسرے میدانوں میں ایک مثالی سربلندی اور استحکام بخشا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعتماد اور بھروسا لا حاصل ہوتا اگر اس میں اللہ کی ذات پر یقینِ محکم موجود نہ ہوتا ایک سچا مسلمان سب سے پہلے اپنے معبود کی لازوال قدرت اور طاقت پر بھروسا کرتا ہے اور پھر صرف اسی کے سہارے اپنی قوتِ عمل پر اعتقاد رکھتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ حکم خدا کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لائے گا تو ہر ہر قدم پہ غیب سے اس کی مدد ہوگی۔

بلاشبہ یہ خود اعتمادی کا جذبہ اس یقینِ محکم کے ساتھ جتنی قوت اور شدت حاصل کرے گا اسی قدر ہم ترقی کریں گے اور اسلام کے دشمنوں کے لیے ناقابل تسخیر بنتے جائیں گے۔

خدمتِ خلق

ہر انسان کی زندگی میں اُس کی دو حیثیتیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو ذاتی اور شخصی حیثیت ہوتی ہے جس کا تعلق صرف اس کی ذات سے ہوتا ہے اور دوسری حیثیت وہ ہے جس کا تعلق دوسروں سے ہوتا ہے اور ان دونوں حیثیتوں کے لحاظ سے اس کے حقوق و فرائض بھی الگ الگ ہیں۔ ان دونوں باتوں میں اتنا گہرا ربط ہے کہ ان میں سے ایک کو دوسری چیز سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس طرح فرد بغیر معاشرہ کے نہ باقی رہ سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے اسی طرح خود معاشرہ بھی افراد کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان کی انفرادی زندگی کے زیادہ تر پہلو اس کی اجتماعی زندگی ہی سے وابستہ ہیں جس کے تقاضوں کو پورا کئے بغیر نہ وہ باقی رہ سکتا ہے اور نہ ترقی کے راستہ پہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

پیدائش کے وقت سے لے کر حیات کے آخری لمحہ
تک انسان اپنی ترقی، تحفظ، تربیت، تعلیم، صحت اور
ساری ضرورتوں اور تمام تقاضوں میں بغیر دوسروں سے
مدد لیئے ہوئے ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ اس کا حاصل یہ
ہوا کہ اگر کوئی فرد اپنی زندگی اور فلاح و ترقی چاہتا ہے تو
اس پر ضروری ہے کہ وہ اس معاشرہ کی بقا اور خوش حالی
کے لیئے ہر ممکن خدمت انجام دے جس کے اندر وہ جی رہا ہے
جو نتیجہ کے اعتبار سے خود اس کی اپنی ذات ہی کی خدمت ہوگی
اس لیئے کہ جس قدر اس کا ماحول بہتر ہوگا اور گرد وپیش کے
حالات سدھر تے جائیں گے اس کے سارے فائدے خود اس کی
ذات کو حاصل ہوں گے اور جس حد تک معاشرہ کے دوسرے
افراد کی صلاحتیں بہتر ہوں گی اسی حد تک ہر فرد اُن سے فائدہ
اٹھا سکے گا۔ اس طرح یہ باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی
خدمت کا جذبہ ہی درحقیقت انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی
کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کی
شدید مذمت فرمائی ہے جو دوسروں کی ضرورتوں میں
ان کی مدد کرنے اور اُن کے ساتھ ہمدردی کرنے سے کتراتے ہیں

ان الفاظ کے ساتھ :- "وَ یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ" (الماعون آیہ ۷) اس طرح پیغمبر اکرم نے بھی اپنے ارشادات میں ہر انسانی فرد کو اس کی ہدایت فرمائی ہے کہ وہ خلق خدا کی خدمت کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔ اسلام کا یہ حکم ہر انسان کے لیے عام ہے خواہ وہ کسی مذہب، کسی نسل و رنگ یا کسی خطۂ زمین سے تعلق رکھتا ہو جہاں تک اس سے مراد ایسی خدمت ہو جو تمام انسانوں کے مشترک فائدے کے لیئے کی جائے۔ اس سلسلہ میں قرآن و حدیث میں جہاں کہیں صرف مسلمانوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی درحقیقت اس تعلیم کا رخ پوری انسانیت کی طرف ہے کیونکہ اسلام کا اصلاحی پیغام ساری دنیا کے لیئے ہے اگرچہ ظاہر میں کبھی موقع اور محل کی مناسبت سے خطاب صرف مسلمانوں ہی کی طرف کیوں نہ کیا گیا ہو، اس کے ساتھ ہی بہت سے موقعوں پر کھلے ہوئے الفاظ میں بھی پورے عالم انسانیت کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک حدیث کے یہ الفاظ ہیں :-

"اَلْخَلْقُ کُلُّهُمْ عِیَالُ اللّٰهِ وَ اَحَبُّهُمْ اِلَی اللّٰهِ اَنْفَعُهُمْ لِعِیَالِهٖ" (اخلاق الکامل ج ۳ ص ۱۹۷) اللہ کی پیدا کی ہوئی

ساری مخلوق (گویا) اس کا کنبہ ہے اور اس میں وہ سب سے زیادہ اس شخص سے محبت فرماتا ہے جو اس کے اس کنبہ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے یعنی اس کی سب سے زیادہ خدمت کرے۔ دوسری حدیث میں اس طرح فرمایا گیا ہے:۔

"خَیْرُ النَّاسِ اَنْفَعُھُمْ لِلنَّاسِ" لوگوں میں سب سے زیادہ بہتر وہ شخص ہے جو انھیں سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں:۔

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا (بخاری) ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو نہ ایک دوسرے پر حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے خدا کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔"

ظاہر ہے کہ اس مقدس فرمان کا مقصد بھی یہی ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرے جیسے ایک بھائی دوسرے بھائی کے ساتھ کرتا ہے۔ سرور دو عالم کے اس ارشاد میں انسانی برادری کا ایک ایسا تصور عطا کیا گیا ہے جس پر اگر خلوص اور سچائی کے ساتھ پوری طرح عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد اور مکر و ظلم سے بھری ہوی دنیا

امن و سکون کی جنت بن جائے اور انسانی معاشرہ سے وہ تمام برائیاں مٹ جائیں جو اس کی تباہی و بربادی کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ مُستدرک حاکم میں ایک حدیث ذکر کی گئی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے :- "تم زمین پر رہنے والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔"

ان الفاظ میں کتنی وسعت ہے۔ اور اس لفظ "رحم" کے اندر حسنِ اخلاق اور حسن معاشرت کی جتنی قدریں ممکن ہو سکتی ہیں وہ سب موجود ہیں۔ یقیناً وہ انسان جو خدائے بزرگ و برتر سے رحم و کرم کا امیدوار ہو اور جس کو یہ یقین ہو کہ اس کی مخلوق پر رحم کیئے بغیر اور اس کی خدمت کیئے بغیر اُسے خدا کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی وہ کبھی خلقِ خدا پر ظلم اور نا انصافی سے کام نہ لیگا اور اس کی خدمت کرنا اور اس کے ساتھ انصاف اور ہمدردی کرنا مہربانی سے پیش آنا۔ اپنا سب سے بڑا فرض سمجھے گا۔

ایک دوسری حدیث کے ان (الفاظ) کی وسعت پر غور کیجیے :- وَ اَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ۔ لوگوں کے لیئے تم وہی بات پسند کرو جس کو تم اپنے لیے چاہتے ہو۔"

اِس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ جب تک مسلمان کے دل میں دوسرے انسانوں کی بھلائی اور خدمت کا جذبہ اور تڑپ موجود نہ ہو وہ پوری طرح اسلام کی تعلیم پر عامل نہیں سمجھا جا سکتا - ان تمام ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ساری انسانی برادری اور پوری نوع بشر کے احترام پر کتنا زور دیا ہے اور خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی، اُس کی خدمت اور اُس کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کی کتنی تاکید کی ہے - یہ تو صرف انسانی برادری کا ذکر تھا - اسلام نے تو اس جذبۂ خدمت و ہمدردی کو کائنات کی ہر مخلوق کے لیئے وسعت دی ہے -

ایک مرتبہ صحابہؓ کرام نے نبی کریمؐ کی خدمت میں عرض کی اے خدا کے نبیؐ! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے؟ آپؐ نے فرمایا :- ہر نم اور تر جگر رکھنے والی ہستی کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے"

مطلب یہ ہے کہ ہر اُس مخلوق کے ساتھ نیک سلوک کرنے اور اس کی خدمت کرنے میں ثواب عطا کیا جائے گا جو اپنی ذات میں زندگی کی تری رکھتی ہے، خواہ وہ انسان ہو یا

کوئی اور ہو - غرض اسلام نے انسان کے دل میں خلق خدا کی محبت اور خدمت کے جذبہ کی اس طرح تخلیق کی ہے جس کی کوئی دوسری مثال اسلام کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی - اگر انسان اس اسلامی تعلیم کی اہمیت کو سمجھے اور اس پر پوری طرح عمل کرے کہ دوسروں کی خدمت کرنے اور انہیں فائدہ پہنچانے کو خود اپنا ہی فائدہ سمجھنے لگے اور ان کی تخریب اور تباہی کو اپنی تعمیر اور کامیابی نہ خیال کرے تو پورے انسانی معاشرہ سے بڑی آسانی کے ساتھ تمام اخلاقی برائیوں کو دور کیا جا سکتا ہے اور اسے تباہی و بربادی کے عظیم خطرہ سے نجات حاصل ہو سکتی ہے -

یکجہتی

یکجہتی انسان کی اجتماعی زندگی کی فلاح وبہبود کی سب سے ضروری اور سب سے بڑی بنیاد ہے جسکے بغیر کسی قسم کی ترقی اور خوشحالی ممکن نہیں ہوسکتی۔ نااتفاقی اور انتشار ایک انتہائی مہلک زہر ہے جو معاشرے میں پھیل جانے کے بعد اسے کہیں کا نہیں رکھتا۔ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ عرب قبائل میں بات بات پر خون کی ندیاں بہا کرتی تھیں یہاں تک کہ معمولی جانوروں کے لئے بھی اشرف مخلوقات انسان کا قیمتی خون پانی کی طرح بہتا رہتا تھا۔ پورا جزیرہ نمائے عرب بدامنی اور بدحالی کا شکار تھا، دشمنی وعداوت، حسد اور کینہ، غرور اور تکبر لوگوں کی رگوں میں پیوست ہوچکا تھا۔ کسی کی نہ تو جان محفوظ تھی اور نہ آبرو اور مال ودولت، لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ انسانی اقدار کب کی فنا ہوچکی تھیں۔ سرورِ

کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے دنیا میں تشریف لاکر انتشار پسند انسان کو امن وصلح کی تعلیم دی اور قرآنِ حکیم کا یہ پیغام سنایا کہ بلا کسی شرعی جرم کے ایک آدمی کا قتل کرنا بھی تمام اولادِ آدمؑ کو قتل کر دینے کے برابر ہے اور ایک آدمی کو زندگی دینا پوری انسانیت کو زندہ کر دینے کے برابر ہے۔ آپ نے میدانِ عرفات کے عظیم اور تاریخی اجتماع میں دنیا کو ایک ایسے رشتہ سے آگاہ فرمایا جو خاندانی رشتوں اور دوسرے تمام رشتوں سے بہت زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے اور جس میں بنی نوعِ انسان کی ترقی و خوشحالی اور عزت وسربلندی کے تمام راز پوشیدہ ہیں یہی وہ رشتہ تھا جس میں انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تمام الجھنوں کا علاج موجود تھا اور تباہی وبربادی سے نجات کی مکمل ضمانت تھی۔ یہ رشتہ ایمان واسلام اور سچائی وتوحید کا رشتہ تھا جس سے ایسے تمام لوگ جو نسلی، خاندانی، جغرافیائی، لسانی اور رنگ وملک کی تفریقوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان تفریقوں کی قربان گاہوں پر اپنی زندگی اور اپنی زندگی کی تمام قدروں کو بھینٹ چڑھا چکے تھے۔ وہ

سب کے سب مل جل کر ایک ایسی اکائی اور وحدت میں تبدیل ہو گئے جو ساری دنیا کے لیئے ناقابل تسخیر بن گئی۔ اسکی اصلی وجہ صرف یہ تھی کہ طاقت و قوت کا اصلی سرچشمہ انتشار و افتراق اور آپس کی پھوٹ میں نہیں بلکہ باہمی اتحاد و اتفاق، یکجہتی، مرکزیت اور آپس کی وحدت میں ہے۔ اس نئے رشتہ نے تمام انسانی برادری کے دلوں میں محبت و اخوت کی ایک زبردست روح پھونک دی اور جو لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہا کرتے تھے وہ اپنے تمام مادّی رشتوں کو اس ایمانی رشتہ پر قربان کرنے لگے۔ اور آپس میں سگے بھائیوں سے بھی زیادہ قریب تر ہو گئے۔ بزرگ و برتر اللہ کا مقدس رسولؐ لوگوں کو اس کا یہ پیغام سنا رہا تھا:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران آیہ/۱۰۳) تم سب الٰہی رشتہ کو یعنی دین کے رشتہ کو مضبوط تھام لو۔ اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔ اور کبھی ان لفظوں میں: وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا (انفال آیہ/۴۶) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑے نہ کرو ورنہ تم ہمت ہار جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ

جائیگی اور صبر کرتے رہو"۔ سرورِ دو عالم کا ارشاد ہے کہ تمام مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے میں ایک جسم اور ایک بدن کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اگر بدن کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا بدن اس تکلیف کا احساس کرنے لگتا ہے۔ بس اسی طرح اسلامی معاشرہ بھی ایک جسم اور ایک بدن کی طرح ہے اور تمام مسلمان اس کے اعضاء ہیں پھر سچا مسلمان تو وہی ہے جسکے دل میں اپنے مسلمان بھائی کی تکلیف کا درد اور اس کے دکھ کا احساس موجود ہو اور وہ اس دکھ درد کو دفع کرنے کی اسی طرح سعی و کوشش کرے جیسے وہ اپنے درد کو دور کرنے کے لیئے کرتا ہے۔

بلاشبہ اتحاد و یکجہتی ہی میں ہماری نجات اور خوشحالی اور قوت و استحکام ہے اور افراتفری اور انتشار میں ہماری کمزوری، بدحالی اور بربادی و موت مضمر ہے۔

حجۃ الاسلام علامہ سید محمد رضی مجتہد کی بعض تصنیفات

• درسِ قرآنِ حکیم کی دو جلدیں۔ طبع ہو کر پریس سے آگئی ہیں جلد اول کا دوسرا اڈیشن ہے اور جلد دوم کا پہلا اڈیشن ہے۔ انداز درس انتہائی مؤثر۔ عبارت میں غضب کی سلاست اور بے مثال روانی ہے کاغذ چکنا سفید۔ جلد پائدار۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ کتب فروش جلد متوجہ ہوں۔

• خُطبات :۔ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے ہر جلد میں ساڑھے تین سو سے زیادہ صفحات ہیں "خطبات"، علامہ موصوف کی ان سینکڑوں تقاریر کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن سے نشر کی ہیں اور جن سے پورے کرۂ ارض کے کروڑوں تشنگانِ علم و ادب سیراب ہوتے رہے ہیں۔ اور انکی افادیت کا سکہ جما ہوا ہے۔ ذاکرین، مقررین، طلبہ اور مصنفین کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے کتب فروش متوجہ ہوں۔ کاغذ چکنا سفید سائز ۲۰×۳۰/۱۶ (کمیشن مناسب دیا جائیگا)

• شہادت کبریٰ حصہ دوم کی کتابت تیزی سے جارہا ہے۔ اور
• شہادت کبریٰ حصہ سوم کا مسودہ زیر ترتیب ہے۔
• شہادت کبریٰ حصہ اوّل کی بہت کم کاپیاں رہ گئی ہیں جلد حاصل کیجیے۔

پتہ :۔ ادارۂ نشرِ علومِ دینیہ سی ۹۶۱ بلاک نمبر ۱۰ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی
ٹیلیفون نمبر :۔ 683025